عابد صدیقی
ادب اور صحافت

ادب و صحافت

عابد صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (عثمانیہ)
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
لکچرار آرٹس اینڈ سائنس کالج، سکندرآباد (عثمانیہ یونیورسٹی)

ترتیب و اہتمام : ڈاکٹر سید غوث الدین

بار اوّل نومبر ۱۹۸۴ء

تعدادِ اشاعت : پانچ سو

قیمت : تین روپے پچاس پیسے

سرِورق : غوث محمد

کتابت : ضمیر زاہد ، سید محمود

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد

ناشر : نیرنگ اکیڈمی ، حیدرآباد

(ملنے کے پتے)

۱۔ مغل پورہ ۱۹۲-۲-۲۳ ، حیدرآباد ۔ ۲

۲۔ نیرنگ اکیڈمی گھانسی بازار ، حیدرآباد

۳۔ دفتر "رہنمائے دکن" ، افضل گنج ، حیدرآباد

۴۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو ، کنارا بینک ، عابد روڈ ، حیدرآباد

میری والدۂ محترمہ کے نام

جن کے حوصلہ اور شفقت نے

مجھے جینے کا سلیقہ سکھایا

عابد

فہرست

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنیٰ کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

اقبال

ڈاکٹر غلام عمر خاں
ام اے بی ای ڈی، پی ایچ ڈی
ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

سمن زار، ۲-۶-۳۴
اکبر باغ، حیدر آباد

تعارف

عابد زین العابدین صاحب
باصلاحیت اور حوصلہ مند نوجوان ہیں
گریجویشن کے بعد کچھ عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ تھے
دو سال قبل انہوں نے شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی سے ام اے کیا۔
اور درجہ اول میں
کامیابی حاصل کی۔ پھر جرنلزم سے بھی ڈگری لی۔
ادھر کچھ عرصہ سے یونیورسٹی کالج آف آرٹس اینڈ سائنس
سکندر آباد میں،
اردو کے لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں
اور پی ایچ ڈی کے لئے
تحقیقاتی کام کا آغاز بھی کیا ہے۔
صحافت کے ساتھ ساتھ وہ حیدر آباد کی علمی اور ادبی

انجمنوں سے بھی وابستہ رہے ہیں

اور اچھے مقرر بھی ہیں۔ گزشتہ چار سال

کے دوران مجھے عابد صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

وہ مہذب، شائستہ اور صاحب کردار نوجوان ہیں۔

شعر و ادب کی بساط کے تازہ واردوں' یا

شعر و ادب کی ہوس کے شکار نوجوانوں میں بسا اوقات

جو آشفتہ مزاجی

اور بے راہ روی پائی جاتی ہے،

عابد صاحب، اس سے یکسر مبرا ہیں۔

ان کے مزاج میں استقامت، سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جو

زمانہ کے سرد و گرم سے آشنا ہونے

اور موافق اور ناموافق موجوں کا، پامردی کے ساتھ

سامنا کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہیں،

اور زندگی میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا حوصلہ

اور سلیقہ عطا کرتی ہیں۔

پیش نظر مجموعہ

عابد صدیقی صاحب کے مضامین پر مشتمل ہے،

جو شعر و ادب
اور صحافت کے موضوعات سے متعلق ہیں۔ یہ مجموعہ
ادبی دنیا میں، ان کے نقشِ اوّل کی
حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم "اقبال اور بھرتری ہری"
اور دوسرے بعض مضامین میں، عابد صاحب نے تلاش
و تفحص کے ساتھ ایسا
مواد پیش کیا ہے جو یقیناً دلچسپی سے پڑھا
جائے گا۔

مجھے توقع ہے کہ
عابد صدیقی صاحب انہماک اور توجہ
کے ساتھ لکھنے کی مشق جاری رکھیں گے،
اور اردو ادب میں
اپنا مقام پیدا کریں گے۔

غلام عمر خاں
شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

۱۷ نومبر ۱۹۷۴ء

چند باتیں

ادب اور صحافت کے موضوعات پر مبنی پیش نظر مضامین کا یہ مجموعہ ادبی میدان میں میری اولین کوشش کی حیثیت رکھتا ہے جسکو میں طالبعلمانہ کوشش قرار دیتا ہوں میں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اسکا اندازہ تو میرا خیال ہے کہ قارئین ہی کر سکیں گے۔ جب تک انسان کچھ غلطیاں نہ کرے اور کچھ لغزشوں سے دوچار نہ ہو، وہ صحیح راستہ پر تیز گامی کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتا اسی ایقان نے مجھے مختلف ادبی و صحافتی موضوعات پر لکھنے کی جانب مائل کیا ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں ام اے کی تعلیم کے دوران میں نے چند مضامین لکھے تھے جن میں سے دو مضامین ضروری حذف و اضافہ کے بعد زیر نظر کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

میں تقریباً چار سال سے صحافت سے وابستہ رہا ہوں اور حال میں ام اے کے بعد جرنلزم کی ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی اسطرح ادب اور صحافت ایک عرصہ سے میرا دلچسپ موضوع رہے ہیں۔

شعر و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جیسے صحافت کا عملی تجربہ بھی حاصل رہا ہے مجھے ادب اور صحافت کے دونوں شعبوں کے باہمی فرق کو سمجھنے کا موقع ملا ہے ادب اور صحافت میں متعدد امور مشترک بھی ہیں اور جداگانہ بھی۔

آج مغرب میں صحافت اور ادب دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش چل رہے ہیں اردو میں بھی اس نئے رجحان کو تقویت دینے کی ضرورت ہے تاکہ اچھی صحافتی تحریر ادب میں اور سلیس و عمدہ ادبی تحریریں، صحافت کے زمرہ میں شامل ہوں۔ میں نے ادب اور صحافت کو اسی نقطہ نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے اس کتاب میں ابتدائی مضامین ادبی نوعیت کے ہیں جبکہ دیگر مضامین کا تعلق صحافت سے ہے لیکن میں انھیں ادب کے زمرہ سے خارج نہیں سمجھتا کیونکہ ادب کا زندگی سے اور زندگی کا صحافت سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اقبال اور قدیم ہندوستانی طرز فکر کے موضوع پر میں محترم ڈاکٹر غلام عمر خاں کی نگرانی میں پی۔ ایچ ڈی کر رہا ہوں "اقبال اور بھرتری ہری" دراصل اسی تحقیق کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے بعض مضامین حال کے تحریر کردہ ہیں ان تمام مضامین میں وہ ناقدانہ نظر اور بلیغ فکر شاید نہ ملے جو کہ عموماً ادبی و تنقیدی مضامین میں تلاش کی جاتی ہے لیکن وہ نقطہ ضرور ملیگا جس سے فکر و نظر کے زاویوں کو پہچانا جا سکتا ہے

ہر چند بگولہ مضطر ہے، اک جوش تو اسکے اندر ہے
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے بے چین سہی برباد سہی

میں اُردو کی ممتاز نقاد اور ادیب پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اُردو کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنکی رہنمائی اور حوصلہ افزائی مجھے ہمیشہ حاصل رہی ہے، میرے محترم و شفیق استاد، دانائے رازِ ماہر اقبالیات ڈاکٹر غلام عمر خان ریڈر شعبہ اردو کی رہنمائی اور انکے گراں قدر مشوروں نے ہمیشہ میری ہمت بندھائی جسکے لیے میں انکا ہمیشہ کی طرح ممنون ہوں اسکے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے تمام اردو اساتذہ بالخصوص، ڈاکٹر سید حمید شطاری اور ڈاکٹر مغنی تبسم کا بھی ممنون ہوں۔

میں محترم سید حنیف الدین قادری ٹیچنگ اسسٹنٹ جنا ٹیلے وکن کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کیونکہ انکی قیمتی رائے اور گراں قدر تعاون اس کتاب کی تکمیل میں معاون رہا، میرے مخلص دوست ڈاکٹر سید غوث الدین جنرل سکریٹری نیرنگ اکیڈیمی، جناب حسن فرخ اور بہن انیسہ پروین نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا انکے اس خلوص کی میں بے حد قدر کرتا ہوں۔ جناب محمد غوث نے سرورق پر اپنے فکروفن کا جو خوبصورت مظاہرہ کیا ہے، وہ خود انکا تعارف ہے میں انکے فن اور خلوص کا قدرداں ہوں، آخر میں، میں اپنے محسن اور سرپرست بھائی جناب نصیر اختر صدیقی اور جناب محمود الدین حامد کی خدمت میں اظہار تشکر کرتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں میری تمام کوششیں و کاوشیں انکے بے لوث پیار اور بے مثال ایثار کا نتیجہ ہیں۔

عابد صدیقی

۱۷ر نومبر ۱۹۷۴ء

۲-۲۳-۱۹۲، مغل پورہ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

اقبال اور بھرتری ہری

اقبال کی شاعری میں مشرق اور مغرب کی طرز فکر کی آمیزش نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ جہاں وہ فلسفہ مغرب کے ماہر تھے، ایشیائی اور بالخصوص ہندوستانی افکار کا بھی گہرا اثر انھوں نے قبول کیا۔ رام چندر جی، گوتم بدھ، وشوامتر، سوامی رام تیرتھ، گرو نانک اور بھرتری ہری جیسی بلند پایہ شخصیتوں کے افکار و تصورات نے ان کی فکر و نظر کے اُفق کو وسعت دی۔ قوت عمل آزادی، فقر اور نیکی کے وہ اعلیٰ اقدار جو کہ 'عارفان ہندی' سے عبارت ہیں انھیں اقبال نے اپنے نور بصیرت سے شاعری کے ذریعہ روشن کیا۔ رگ وید کے منتر گایتری کا ترجمہ ان کی نظم 'آفتاب' ہے جس میں ہندوستانی فلسفہ و تمدن کی روح بولتی نظر آتی ہے۔ اقبال خصوصی طور پر سنسکرت کے عظیم شاعر بھرتری ہری سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ بال جبریل کا آغاز اقبال نے بھرتری ہری کے شعر کے ترجمہ سے کیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

ایک اور مقام پر وہ اسی خیال کی ترجمانی فارسی کے اس مشہور شعر کے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

(جب دیکھو کہ سامعین میں ذوق کی کمی ہے تو آواز میں شدت پیدا کرو اور جب دیکھو کہ محمل بہت گراں ہے تو حدی کو بلند آواز سے گاؤ)

اقبال جاوید نامہ میں مولانا رومی کے ہمراہ افلاک کی سیر کرتے ہوئے آن سوئے افلاک (جنت الفردوس) پہنچتے ہیں جہاں وہ بھرتری ہری سے اسکے فکر و فن کے بارے میں آگہی حاصل کرتے ہیں۔ پیر رومی بھرتری ہری کا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں۔

آن نوا پرواز ہندی را نگر
شبنم از فیض نگاہ او گہر
نکتہ آرائے کہ نامش برتری است
فطرت او چوں سحاب آذری است

(اس ہندی نغمہ سرا کو دیکھو جس کے فیض نگاہ سے قطرۂ شبنم بھی گوہر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کے نکتہ شناس کا نام بھرتری ہری ہے جس کی فطرت ماہ آذر میں برسنے والے بادل کی سی ہے۔)

سنسکرت ادبیات میں ساتویں صدی عیسوی کے شاعر بھرتری ہری کو نمایاں مقام حاصل ہے وہ ایک ممتاز شاعر، بلند پایہ فلسفی اور محقق زبان تھے۔ بھرتری ہری اوجین کے راجہ اور مہاراجہ وکرمادتیہ کے بھائی تھے چینی سیاح ہیونگ سانگ نے اپنے سفرنامہ ہند میں لکھا ہے کہ ہری ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاہی زندگی کی شان و شوکت اور عیش و سرود کے ماحول نے انکے مزاج میں عشق و محبت کی کیفیات پیدا کیں وہ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ ویدانتی فلسفہ سے متاثر ہونے کے باوجود انھوں نے عشق کو عقل پر ترجیح دی۔ بھرتری ہری کے تین شعری مجموعے نیتی ستا کا CENTURY OF CONDUCT، سرینگار اکتا کا CENTURY OF LOVE اور ویراگیا ستا کا CENTURY OF RENUNCIATION ہیں جن میں پہلا مجموعہ نیکی و اخلاق دوسرا عشق و محبت اور تیسرا روحانی

و دنیوی زندگی سے متعلق موضوعات پر مبنی ہے۔ بھرتری ہری کے ان شعری مجموعوں کا انگریزی، فرانسیسی، لاطینی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انھوں نے صرف ونحو (قواعد) پر ایک مشہور کتاب 'واکیا پاڈیا' بھی لکھی۔ اس کے علاوہ ایک اور نظم 'بھٹی کویا' بھی بھرتری ہری سے منسوب کی جاتی ہے۔

ابتدائی زندگی میں حسن کی جلوہ سامانیوں اور آرٹ کی سحر آفرینیوں سے بھرتری ہری اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی شاعری، حسن پرستی اور عشق و محبت کی کیفیات سے معمور ہو گئی۔ انھوں نے سرینگارا ستکا میں بڑے حسین و لطیف پیرائے میں جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ درختوں پر غنچوں کی شادابی کو دیکھ کر یہ اندازہ قائم کرنا کہ بہار کے یہ آثار دراصل اس کی محبوبہ کے اس راہ سے گزرنے کا نتیجہ ہیں۔ متخیلہ کا یہ حسن بھرتری ہری کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ پھر اس حسن پرست شاعر کی زندگی ایک نئے تجربے سے دوچار ہوتی ہے اپنی عزیز ترین محبوبہ کی بے وفائی اور محبت میں شکست کا احساس بھرتری ہری کو مادی زندگی کی پر فریب راہوں سے ہٹا کر روحانیت کی منزل سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ انھوں نے پوری زندگی میں سات مرتبہ مادی و روحانی زندگی کے راستے طے کئے اور آخر کار عشق حقیقی کی منزل پر پہنچ کر اپنے نور بصیرت سے قلب و ذہن کے نئے جہاں آباد کئے۔ تخت و تاج کو چھوڑ کر صحرا نوردی کی خاک چھانی تا کہ زندگی کا حقیقی سراغ پا سکیں۔ فقر کے اس پر عظمت مقام نے ان کی شاعری کو پر عظمت بنا دیا اور ان کے تخیلات کو فکر و نظر کے سرمایہ سے مالا مال کر دیا۔ اقبال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

پادشاہے با نوائے ارجمند
ہم بفقر اندر مقام او بلند

[وہ (بھرتری ہری) بادشاہ بھی ہے اور عظیم شاعر بھی اور یہ
اعتبارِ فقر بھی اِس کا مرتبہ بُلند ہے]

نقشِ خوبے بند د از فکر شگرف
یک جہاں معنیٰ نہاں اندر دو حرف!

(اس نے اپنے نادر افکار سے بڑے خوبصورت و رنگین نقوش
پیدا کئے ہیں اور اس کے دو حرفوں میں معانی کی ایک دنیا
پوشیدہ ہوتی ہے)

کارگاہِ زندگی را محرم است
او جم است و شعر او جامِ جم است

(وہ کارگاہ زندگی کا راز داں ہے وہ گویا جمشید ہے اور اسکے
اشعار جامِ جم کی حیثیت رکھتے ہیں۔)

بھرتری ہری نے کئی برسوں تک بنارس میں ریاضت و عبادت کی اور
سنہ ۶۵۱ء میں وفات پائی بعض روایات کے مطابق انکے بھائی وکرما دیتا نے انھیں
ہلاک کروا دیا تھا آج بھی بنارس اور شمالی ہند کے قصبوں، دیہاتوں میں گداگر
اور فقیروں کی زبان پر بھرتری ہری کے اشعار سُنائی دیتے ہیں جن میں معرفت
اور محبت کی چاشنی ملتی ہے اِن اشعار کے آخر میں بالعموم 'بھرتری ہری کہے'
کا حوالہ بھی موجود ہوتا ہے۔

بھرتری ہری کی شاعری میں بھگوت گیتا، ویدانت اور بدھ مت کی تعلیمات
کا ایک خوبصورت اور دلکش امتزاج نمایاں ہے ان کے نزدیک خواہشاتِ
نفسانی رنج و محن کی تمہید ہیں۔ آرزو کی موت کو وہ حیاتِ دل کا پیش خیمہ
قرار دیتے ہیں۔ شاہانہ زندگی کی نعمتوں کے باوجود انھوں نے اپنا دامن ان
سے بچائے رکھا اور حقیقی و دائمی سرور کے حصول کے لیے عارضی خوشیوں کو
قربان کر دیا۔ نفس کو فقر و غنا کا عادی کیا تاکہ زندگی کے حقیقی سرور سے

ہمکنار ہوسکیں۔ بھرتری ہری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ خواہشات نفسانی کو ترک کرکے انسان کسی بادشاہ کو حاصل ہونے والی مسرتوں کا مالک بن سکتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں زمین اس کا بستر، ہاتھ تکیہ، آسمان شامیانہ اور چاند کا نور اس کے لیے چراغ کی روشنی بن جاتا ہے۔ ترکِ نفس کے سرور سے سرشار کائنات اس کی رفیقِ حیات بن جاتی ہے اور فضا کی چاروں سمتیں مشرق، مغرب، شمال اور جنوب اس کی کنیزیں بن جاتی ہیں اور ہوا کے جھونکوں سے گو اس کے لیے پنکھا جھیلنے لگتی ہیں بھرتری ہری نے فقر، قناعت اور استغنائے نفس کا نہایت اعلیٰ روحانی تصور پیش کیا جو حقیقی روحانی زندگی کی تعبیر و تشریح ہی نہیں بلکہ اسکی مکمل تفسیر ہے۔

بھرتری ہری نے سنسکرت شاعری کو نئی جہتوں سے روشناس کیا ہے انھوں نے بہ یک وقت مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرکے اپنی فنی مہارت اور عظمتِ فکر کا لوہا منوایا ہے۔ اقبال جیسا بلند مرتبت شاعر بھرتری ہری سے اس کی شعریت، سوز اور فنی عظمت کا راز جاننے کے لیے بے چین ہوکر سوال کرتا ہے۔

اے کہ گفتی نکتہ ہائے دلنواز
مشرق از گفتارِ تو دانائے راز
شعر را سوز از کجا آید بگوے
از خودی یا از خدا آید بگوے

[اے شاعر اعظم (بھرتری ہری) تونے (اپنی شاعری میں) بڑے دلنواز نکات بیان کئے ہیں اور مشرق تیرے کلام کی بدولت دانائے راز بنا ہے مجھے یہ بتا کہ شعر میں سوز کہاں سے پیدا ہوتا ہے اس کا سرچشمہ خودی ہے یا خدا کی ذات]

شاعر مشرق اقبال کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بھرتری ہری

شاعری کے فن اور اس کے اسرار پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

کس ندا ند در جہاں شاعر کجاست
پردۂ او ازبم و زیر نواست

(کسی کو پتہ نہیں کہ دنیا میں شاعر کا حقیقی مقام کیا ہے آواز
کا نشیب و فراز اس پر پردہ ڈالے ہوئے ہے)

آن دلِ گرمے کہ دارد در کنار
پیشِ یزداں ہم نمی گیرد قرار

[اس کے (شاعر کے) پہلو میں جو قلب، گرم (پرسوز دل) ہے
وہ حضورِ خداوندی میں بھی مضطرب و بے قرار رہتا ہے)

جانِ ما را لذت اندر جستجو ست
شعر را سوز از مقامِ آرزوست

(صرف تڑپ اور جستجو ہی میں ہماری روح کو لذت حاصل ہوتی ہے
اور شعر میں سوز اسی مقامِ جستجو یا مقامِ آرزو کے باعث
پیدا ہوتا ہے)

آگے چل کر بھرتری ہری اعلیٰ شاعری کے مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے
اقبال سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔

اے تو از تاکِ سخن مستِ مدام
گر ترا آید میسر این مقام
بادو بیتے در جہانِ سنگ و خشت
می توان بردن دل از حورِ بہشت

[تم (اقبال) جو شرابِ سخن سے ہمیشہ مدہوش رہتے ہو، اگر
تمہیں یہ مقام میسر ہو جائے تو اس جہانِ سنگ و خشت
(مادی دنیا) میں موزوں کیے ہوئے دو اشعار کی مدد سے

حوران بہشتی کے دلوں کو موہ لینا ممکن ہے]

بھرتری ہری کی شاعری میں جہاں فنی عظمت اور شعری حسن ہے وہاں اس کے افکار نیکی، شرافت اور سچائی کا سرچشمہ ہیں۔ اقبال کی طرح انھوں نے بھی نیک عمل کو کامیاب زندگی کی اوّلین شرط قرار دیا ہے۔ اقبال نے جہاں عملِ صالح پر زور دیا ہے ہری نے بھی نیکی اور بہترین اعمال ہی کو زندگی کی حقیقی معراج سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک بند میں لکھتے ہیں

دنیا پائیداری' زندگی کی اصل حقیقت ہے جیسے پانی میں
آفتاب کا عکس اسلئے اس حقیقت کو پانے کے بعد
انسان کو چاہیئے کہ وہ نیکی اور نیک عمل کو اپنی عادت بنالے'

بھرتری ہری نے 'عمل صالح' کو ازلی و ابدی زندگی کا شریک ٹھیرایا ہے موت کے بعد بھی نیک اعمال نہ صرف اس کے ہم سفر ہوں گے بلکہ دنیا میں اسکی ناقابلِ تسخیر عظمت کا ثبوت ہوں گے۔ ورنہ گناہ اور بداعمالیاں رنج و مصائب کے وجود کا سرچشمہ بھی ہیں اور دل کی موت کا اعلان بھی۔ اس لیے انسان کو نیکی کی راہ سے رفعت اور بلندی کے حصول کے لیے جد وجہد کرنی چاہیئے۔ بھرتری ہری نے عبادت و ریاضت کو ذوقِ عمل کے بغیر بے جان' بے لطف اور غیر موثر قرار دیا ہے۔ پھر مادرِ ہند کا عظیم سپوت اقبال' سرزمین ہند کے اپنے پیشرو فلسفی شاعر سے' ہندوستان کے موجودہ مصائب کا حل دریافت کرتا ہے۔

ہندیان را دیدہ ام در پیچ و تاب
سرِّ حق وقت است گوئی بے حجاب

(میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستانی بڑے پیچ وتاب اور اضطراب کے
عالم میں ہیں اور اب وقت ہے کہ تو برملا اسرارِ حق کو بیان کرے)

اس کے بعد بھرتری ہری گویا اسرارِ حق کو فاش کرتے ہیں اور اس کی اس حسنِ فکر کو اقبال اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں (دراصل یہ بھرتری ہری کے

کے اشعار کا مکمل ترجمہ ہیں) بھرتری ہری کہتے ہیں ۔

این خدایانِ تنک مایہ ز سنگ اندوز خشت
برترے ہست کہ دور است ز دیر و ز کنشت
سجدہ بے ذوق عمل خشک و بجائے نرسد
زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت

(یہ خداوندانِ کم مایہ پتھر اور اینٹ کے بنے ہوئے ہیں لیکن بھرتری ہری دیر و کنشت سے دور ہے

سجدہ جو ذوق عمل سے عاری ہو وہ خشک و بے جان بھی ہوتا ہے اور اس طرح کے سجدہ سے مدعا بھی حاصل نہیں ہوتا اسلئے زندگی (میری نظر میں) یکسر کردار ہے خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا)

اقبال نے کم و بیش اسی خیال کو ایک اور مقام پر بیان کیا ہے

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

صنم آشنائی دراصل بد اعمالیوں کی ایک علامت ہے اور بد اعمالی سے مغلوب دل اگر سجدہ ریز بھی ہو تو اسے کس طرح لذّت و سرور اور روحانی آسودگی حاصل ہو سکے گی ۔ اقبال اور ہری کے تصوّرات میں اس اعتبار سے اکثر مقامات پر ہم آہنگی اور مطابقت جھلکتی نظر آتی ہے ۔

بھرتری ہری نے جہاں نیکی اور اعمال صالح کو انسان کی رفعت اور بلندی کا پیمانہ قرار دیا ہے وہاں وہ نیکی اور کبر کی یکجائی کے منکر ہیں ان کا خیال ہے کہ نیکی اور شرافت ، سادگی و خاکساری کے جذبات پیدا کرتی ہے جو شخص جس قدر بلند صفات کا حامل ہوگا وہ اتنا ہی منکسر المزاج اور نیک طینت ہوگا چنانچہ ایک بند میں بھرتری ہری نے لکھا ہے کہ

پھلوں سے معمور درخت ہمیشہ جُھکے رہتے ہیں
پانی کی افراط سے بھرپور، بادل جو
بارش برسانے والے ہوں جھکے رہتے ہیں
اسی طرح جو لوگ اعلیٰ کردار کے حامل ہوں وہ
اپنی دولت اور قابلیت پر اِتراتے نہیں
بلکہ دوسروں سے ان کا سلوک نہایت
نیک ارادہ اور جذبہ کے تحت ہوتا ہے،

اقبال نے بھی اکثر مقامات پر صداقت، خیر اور انصاف پر مبنی اپنے تصورات میں اِس زاویہ فکر کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اسلامی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے نصب العینی انسان کی اُن خصوصیات کا جگہ جگہ اپنے کلام میں ذکر کیا ہے جو اعلیٰ روحانی اقدار اور شرافت، شائستگی، مروّت اور انکسار کے اِمتزاج سے عبارت ہوتی ہیں ذیل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اِس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

بھرتری ہری نے زندگی کے بے شمار اسرار کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کی شاعری میں آفاقیت یا عالمی برادری کا تصور بھی ملتا ہے۔ بدھ مت نے رواداری اور انسانی محبت کی جو تعلیم دی اس سے وہ بے حد متاثر تھے۔ اور اپنی شاعری میں اِس نقطۂ نظر کی وسیع پیمانہ پر تلقین کی ہے۔ ہری نے پوری انسانی سوسائٹی کو ایک کنبہ قرار دیا ہے۔ رنگ، نسل، مذہب، ذات پات علاقوں اور

زبانوں کی حد بندیاں ان کے نزدیک ایک غیر انسانی تصور ہے وہ انسانی نقطۂ نظر میں ایسی ہمہ گیر تبدیلی کے مدعی ہیں کہ ایک فرد دوسرے فرد سے، یا ایک قوم دوسری قوم سے اجنبیوں جیسا سلوک نہ کرے۔ اور ایسا رویہ اختیار کرے جو خاندان کے افراد باہمی طور پر ایک، دوسرے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر ہری کہتے ہیں کہ

"تنگ نظر لوگ دوسرے انسان کو اجنبی قرار دیتے ہیں
جبکہ نیک اور فراخ دل شخصیتیں کُل انسانی برادری کو
اپنا خاندان متصور کرتی ہیں۔"

بھرتری ہری کا یہ عالمگیر فلسفہ اقبال کے آفاقی تصوّر سے مشابہ ہے اقبال نے بھی، متعدد مقامات پر رنگ نسل ذات پات وطن زبان اور علاقوں کے حدود سے نکل کر دنیا کے اس سرے سے اس کونے تک پھیل جانے کی ترغیب دی ہے۔ اقبال کا نصب العین انسان 'مرد مومن' یا 'مرد مسلم' بھی خود کو ایک آفاقی انسان تصور کرتا ہے۔ اور کرۂ ارض کے مشرق سے لے کر مغرب تک ہر خطّہ زمین کے باشندہ کو اپنا ہم وطن تسلیم کرتا ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

اقبال نے خودی کے جس اعلیٰ اور ہمہ گیر تصور پر زور دیا ہے اس کی روشنی کی کرن بھرتری ہری کے افکار میں مسکراتی نظر آتی ہے ہری نے بھی انسان کی قوت و قدرت کو تسلیم کیا ہے کہ یہ ساری کائنات میں جو تعمیر و ترمیم کے نقوش نظر آرہے ہیں وہ دراصل انسان کی محنت شاقہ اور کوشش و سعی کا ثمر ہیں۔ ہر وجود انسان کی عظمت رفعت اور اس کی قوت و قدرت کا اعلان ہے اس لیے انسان کو چاہیئے کہ وہ صرف خدا کی ذات پر بھروسہ

کر کے کوشش و سعی اور عمل پیہم سے غفلت و بے نیازی نہ برتے۔ بھرتری ہری اسرار حق بیان کرتے ہوئے اس نکتہ کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔

فاش گویم بتو حرفے کہ ندانند ہمہ کس
اے خوشا بندہ کہ بر لوح دل اورا بنوشت
ایں جہانے کہ تو بینی اثر یزداں نیست
چرخہ از تست وہم آں رشتہ کہ بردوک تو اشت

(میں تمہیں ایک بات بتلا بتاؤں جس پر کسی کی نظر نہیں ہے اور خوش قسمت ہے وہ انسان جو اس نکتہ کو اپنے لوح دل پر لکھ لے کہ یہ دنیا جو تو دیکھ رہا ہے یہ خدا کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چرخہ بھی تیرا ہے اور وہ دھاگا بھی تیرا ہے جسے تو نے اپنے تکلے سے کاتا ہے)

بھرتری ہری نے اسرار حق کا پردہ چاک کرتے ہوئے آخری مرحلہ پر زندگی کا سب سے عظیم نکتہ اقبال کی نذر کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

پیش آئین مکافات عمل میں سجدہ گزار
زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

[مکافات عمل (اعمال کا بدلہ) کے اصول کے آگے سر تسلیم خم کر دو کیونکہ بہشت دوزخ اور اعراف کے سارے مقامات عمل ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں]

اس شعر میں بھرتری ہری نے جس تصور کو پیش کیا ہے وہ اقبال کے خیالات سے بے حد مطابقت رکھتا ہے۔ اقبال نے بھی عمل کو جنت و دوزخ بلندی و پستی اور عظمت و ذلت کا معیار بنایا ہے جو اسلامی فکر کی اساس بھی ہے وہ کہتے ہیں

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بھرتری ہری کی طرح اقبال نے بھی شاعری کو نیا پیرہن عطا کیا۔ یہہ خصوصیت دراصل ان کی فکر و نظر اور بصیرت خیال کی دین ہے چنانچہ رومی، اقبال اور ہری کی اس قدر مشترک 'پُر عظمت شاعری' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

از چمن جز غنچۂ نورس نہ چید
نغمۂ تو سوئے ما اور اکشید

[چمن سے اس نے (بھرتری ہری) نئی اور پر بہار کلیوں کے سوا اور کچھ نہیں چُنا اور تیرے (اقبال) نغموں نے اسے ہماری جانب متوجہ کیا ہے۔]

اقبال اور بھرتری ہری کے فکر و فن کی ہم آہنگی اور عظمت نے ہندوستانی تہذیب و تمدن ہی کو نہیں بلکہ پورے انسانی مزاج کو شدید طور پر متاثر کیا ہے اقبال نے سنسکرت شاعروں میں بھرتری ہری کے افکار و تصورات کو نمایاں اہمیت دی۔ انھوں نے اسے صرف ایک شاعر ہی کے روپ میں نہیں بلکہ ایک فلسفی، صوفی، دانائے راز اور حق پسند انسان کے روپ میں دیکھا جس کا کلام حق کی آواز اور جس کی زندگی صداقت و خلوص کا پیکر تھی چنانچہ بھرتری ہری کے عشق و مستی میں ڈوبے ہوئے حیات افروز اور فکر انگیز کلمات سننے کے بعد اقبال کہتے ہیں

رخت در جانم صدائے برتری
مست بودم از نوائے برتری

[بھرتری کی آواز میری (اقبال) کی روح کی گہرائیوں میں اُتر گئی اور بھرتری ہری کے نغمہ نے مجھے مدہوش کر دیا]

اُردو نثر میں خطوطِ غالب کی اہمیت

ہڈسن کا کہنا ہے کہ شخصی اور انفرادی تجربہ ہی ادب کی بنیاد ہے۔ جس شخصیت میں صداقت زندگی اور ندرت پائی جائے وہ ادب کے سرمائے سے مالامال ہے۔ ناول اور ڈرامے میں شخصیت الگ انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور شاعری میں کچھ اور طرح سے لیکن خطوط میں شخصیت کا مکمل پیکر جاگتا ہے خطوط میں شخصیت خود کلام ہوتی ہے ہم خطوط کے ذریعہ لکھنے والے کے مزاج فطرت اور خیالات و جذبات کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اور بقول مولوی عبدالحق "خط دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے اس میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا خطوط سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا"

خطوط اگر اشاعت کی غرض سے یا کسی مخصوص پروگرام سے لکھے جائیں تو ان میں سیرت کی عکاسی کم ہوتی ہے۔ اور وہاں شخصیت کا عرفان حاصل کرنا مشکل ہے۔

غالب نے خطوط کو گفتگو کا ذریعہ بنایا، مکالمہ کو مراسلہ کا روپ دیا اور گفتگو کو تحریر کا پیرہن عطا کیا۔ انہوں نے اردو شاعری کو جہاں نیا

رنگ و آہنگ عطا کیا۔ وہاں اردو نثر کو نئے اسلوب سے روشناس کیا۔ وہ مکتوب نویسی کے رہنما قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ورنہ اس دور میں اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم کالج سے زیادہ قلعہ دہلی سے وابستہ تھا اور دہلی سے چند ترجمے شائع ہوئے جو ادبی نقطۂ نظر سے رنگینیٔ زبان کے باوجود اصل مقصد اور مطلب سے دور تھے لیکن غالب نے دہلی کی زبان پہ تحریر کا جامہ زیب تن کیا۔ اور اپنی ظرافت و مزاح نگاری کی گل کاریوں سے انہیں دلچسپ اور پر لطف بنا دیا۔ جس سے اردو نثر نگاری میں انہیں منفرد مقام حاصل ہوا۔

مولانا حالی کے مطابق غالب نے ۱۸۵۰ء تک فارسی میں خط و کتابت کی لیکن بعد میں جب تاریخ نویسی کی خدمت پہ مامور کیے گئے تو انہوں نے اردو میں بھی خط و کتابت شروع کردی بعض محققین کا خیال ہے کہ انہوں نے اردو خطوط ۱۸۵۱ء سے لکھنا شروع کیے یہ خطوط آج سے کئی برس قبل تحریر کیے گئے تھے۔ لیکن جن کو بھی انہوں نے یہ خط لکھے وہ نہ رہے اور نہ وہ حالات رہے۔ اسکے باوجود ان کے خطوط میں دلچسپی ہما ہمی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ ان خطوط نے ان تمام افراد کو ہمارے قریب کر دیا ہے جن کو کہ غالب نے یہ خطوط لکھے ہیں۔ غالب کے خطوط میں جو سادگی بے تکلفی اور فطری روانی پائی جاتی ہے اس سے یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ خطوط لکھتے ہوئے انہوں نے یہ گمان بھی نہیں کیا تھا کہ ان کے خطوط شائع ہونگے چنانچہ اس بیان کی تصدیق ۱۸۵۸ء میں منشی شیونارائن کے نام لکھے گئے خط سے ہوتی ہے۔ غالب رقم طراز ہیں۔" اردو کے رقعات جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے ان کی شہرت

میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔" منشی گوپال تفتہ کو بھی تحریر کرتے ہیں کہ " رقعات کو چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے اور اگر تمہاری خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے۔"

غالب کے خطوط خواہ کسی مقصد کے تحت لکھے گئے ہوں لیکن ان میں جو موضوع، مواد، اسلوب اور فن کا بانکپن پایا جاتا ہے اس کی مثال نہیں ملتی

غالب کے خطوط سے قبل اردو میں خطوط کا رواج ہی نہیں تھا۔ اور خاص طور پر اس میں نثر لکھنے کی روایت نہیں پائی جاتی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اردو میں خطوط نویسی کو باقاعدہ رائج کیا بلکہ سادہ اور آسان نثر کی ابتدا کر کے اردو نثر کے مرتبہ کو بلند کیا۔

طرزِ تخاطب: غالب نے ان خطوط میں جدت پسندی اور ندرت پیدا کی ہے انہوں نے تمام فرسودہ روایات تصنع اور تکلف سے یکسر گریز کر کے اپنے خطوط کو القاب اور آداب کی غیر ضروری پابندیوں سے آزاد کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔" پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا" ایسے تمام لوازمات و رسومات جن کو بعض نامہ نگاروں نے اختیار کر رکھا تھا۔ ان سے غالب نے پرہیز کیا ہے۔ انہوں نے اپنے سارے خطوط میں مخاطبت کے لئے میاں، برخوردار، بھائی صاحب، مہاراج، وغیرہ استعمال کیا ہے۔ اور کبھی انہوں نے یکایک مخاطبت کے لئے کوئی لفظ استعمال کئے بغیر ہی اپنا اصل مدعا شروع کر دیا۔

رسمی تکلفات سے اجتناب نے ان کے خطوط کو خلوص، محبت اور یگانگت سے لبریز کر دیا کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مکتوب الیہ

ان کے روبرو رہے۔ اور وہ اس سے بالمشافہ گفتگو کر رہے ہیں۔

ڈرامائی عنصر: مغربی ادب میں قصّے یا واقعات سوال وجواب کی طرز میں پیش کیے جاتے ہیں ان میں سوال کرنے اور جواب دینے والے دونوں کے لیے مختلف نام، علامات یا اشارے ہوا کرتے ہیں تاکہ سوال وجواب کے فرق کو واضح کیا جاسکے۔ غالب نے اس روش کو اختیار کیے بغیر ایسے الفاظ کا مختلف مقامات پر انتخاب کیا ہے کہ جس سے سوال وجواب دونوں کا فرق واضح ہوجاتا ہے انہوں نے اپنے خطوط میں ایک طرح کی ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے وہ القاب اور آداب کو یکسر نظر انداز کرکے ڈرامائی انداز میں مکتوب الیہ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں: "کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آ گئے! میں نے خط تم کو بھیجا ہے! مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے"

مقفیٰ اور مسجّع عبارت: غالب کے دور میں عالمانہ انداز بیان میں مقفیٰ انداز کی نثر کو خاص اہمیت حاصل تھی خود انہوں نے بھی بعض مقامات پر اس طرز کو اپنایا ہے لیکن اس کو جبراً اپنایا نہیں ہے کہ تحریر میں بھدا پن محسوس ہو بلکہ انکے خطوط میں جو مقفیٰ عبارت استعمال کی گئی ہے وہ تحریر کو مزید خوبصورت بنادیتی ہے۔ غلام رسول مہر کے الفاظ میں قافیے اتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں کہ گویا سونے کی انگوٹھی میں بیش قیمت ہیرے جڑ دیئے ہیں"

غالب کے یہ خطوط ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اردو ادب اور زبان کی بے پناہ وسعتوں میں غالب کی انشاپردازی کے جوہر جوہر نایاب ہیں۔ معمولی اور روزمرہ زندگی کے

حالات کو سادگی اور مکمل خوبی اور صفائی سے پیش کرنا انکی نثر کا کمال ہے۔ ان کی تحریر میں بے ساختگی اور بے تکلفی کا جو انداز ہے اس سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور خطوط کے مطالعہ کے بعد ہمارے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کو الفاظ کے انتخاب یا مطلب کے اظہار میں جد و جہد اور عرق ریزی کی کوئی ضرورت نہیں پیش آئی بلکہ ان میں فطری بہاؤ اور ایک طرح کی بے ساختگی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ غالب کے خطوط میں "آملہ ہے۔ "آورد سے ان کا دامن یکسر پاک تھا۔

مکالمہ نگاری: غالب نے خطوط میں بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ ساتھ مکالمہ نگاری کو یوں اختیار کیا کہ ایسا محسوس ہوتا کہ گویا زندگی کے فاصلے گھٹ کر قریب آ گئے ہیں وہ خطوط میں مکالمانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں مرزا حاتم علی مہر سے یوں مخاطب ہیں" مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر اختیار کیا کہ مکالمہ کو مراسلہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:" بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے مکالمہ نگاری ہے۔"

سادگی: غالب کے سارے مکاتیب سادگی کا بانکپن اور تحریر کی اثر آفرینی سموئے ہوئے ہیں۔ اس سادگی سے عامیانہ پن یا بے کیفی پیدا نہیں ہوتی نہ ہی تصنع اور بناوٹ کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ ان کی تحریر میں نفسانی، فنی اور ادبی خصوصیت کا امتزاج ملتا ہے یہ خصوصیت انھیں ایک ممتاز انشا پرداز بناتی ہے۔ غالب نے اپنے تخیل کی بلند پروازیوں اور اپنے نور بصیرت سے خطوط میں طرح طرح کی دلچسپیوں کے

سامان پیدا کر دیئے۔ تحریر کا حسن اور دلکشی معمولی واقعات اور معمولی باتوں کو مناسب الفاظ، تشبیہوں اور متعدد دلچسپ باتوں سے اس طرح آراستہ کیا گیا ہے۔ کہ پڑھنے والا تازگی محسوس کرتا ہے۔ غالب کی ان تحریروں میں ایک روانی اور فطری بہاؤ کی سی کیفیت ملتی ہے۔ آپ کی اس فطری کیفیت کو عبادت بریلوی نے یوں پیش کیا ہے کہ

" غالب کی اردو نثر میں ایسا اسلوب نہیں ملتا جو محنت سے پیدا ہوتا ہے برخلاف اس کے ایک فطری روانی نظر آتی ہے ایک فطری بہاؤ کا احساس ہوتا ہے لیکن اس روانی اور بہاؤ میں پرشور کیفیت نہیں ہوتی بلکہ ایک نغمگی اور غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور یہ سب چیزیں ملکر غالب کی اردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کرتے ہیں "

ان مکتوبات کی سادگی اور فطری روانی کی باوجود ان میں جذبہ صداقت کی شدت، والہانہ خلوص اتھاہ گہرائیاں اور وارفتگی کی نشان جھلکتی ہے۔ تصنع، بناوٹ، مبالغہ آمیزی، الفاظ کی الٹ پھیر اور رنگین بیانی سے دامن بچا کر غالب نے اپنے ہر خط کو خلوص نامہ اور نامۂ محبت بنالیا ہے۔

منظر نگاری: غالب کے خطوط میں سادگی مکالمہ نگاری اور ڈرامائی عنصر کے علاوہ بڑی خوبصورت منظر کشی بھی پائی جاتی ہے اسی میں انہوں نے فارسی انداز کی طوالت اختیار نہیں کی اور نہ ہی فارسی نثر کی طرح رنگین بیانی کو رواج دیا۔ بلکہ معمولی واقعات کو وہ یوں بیان کرتے ہیں جیسے قاری کی نظریں ان واقعات کا مشاہدہ کر رہی ہیں اور وہ غالب کے ہر منظر کو پڑھ کر خود کو اس کا عینی شاہد تصور کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک خط میں برسات کا حال وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے، میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا، مسجد کی طرف کے دالان کو جو دروازہ تھا گر گیا، سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برستی ہے۔"
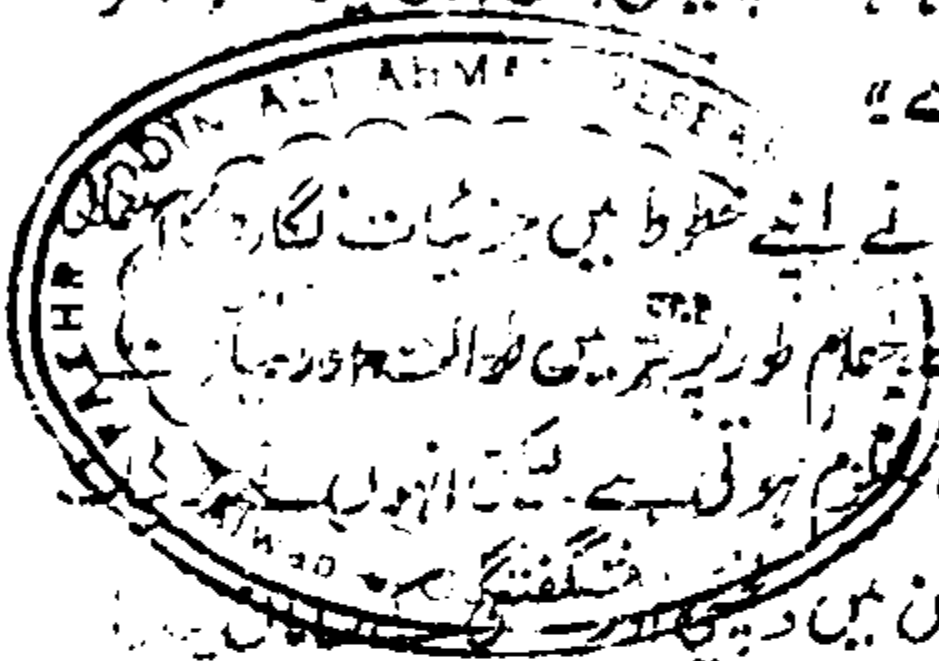
جزئیات نگاری:

غالب نے اپنے خطوط میں جزئیات نگاری کا کمال [illegible] دکھایا ہے۔ عام طور پر تحریر میں طوالت اور [illegible] کی تفصیل بے مزہ اور غیر دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے [illegible] کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان میں دلچسپی اور شگفتگی [illegible] ہوتے ہیں۔

مرزا مہدی مجروح کو لکھتے ہیں "میں یہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا ان کو دیکھا چار دن وہاں رہا پھر ڈاک میں بیٹھ کر گھر آیا۔ تاریخ یاد نہیں مگر ہفتہ کو گیا اور منگل کو آیا، آج بدھ دو فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ میرٹھ آکر دیکھا تو یہاں بڑی شدت ہے۔"

نکتہ آفرینی:

غالب نے اردوئے معلیٰ میں اپنے خطوط کے ذریعہ جو نکتہ آفرینی پیدا کی ہے وہ ان کی فطرت کی ترجمانی کرتی ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا، نکتہ آفرینی کرنا اور اپنی ذہانت طبعی سے کلام کو کئی کئی طرح سے پیش کرنا انکے فن کا بے مثال کارنامہ ہے۔

مرزا چودھری کو لکھتے ہیں، آپ نے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا اگر پیر و مرشد نہ بھی لکھتے تو میں کیونکر اطلاع پاتا، اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصول صحت کی دعا کیونکر مانگتا، کل سے وقت خاص میں دعا مانگ رہا ہوں یقین ہے

ہیں تم تندرست ہو جاؤ گے اور بعد میں یہ خط پاؤ گے۔

شوخی و ظرافت: غالب کے خطوط جہاں ادبی رنگ و روپ لیے ہوئے ہیں وہاں ان میں شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جو انکی حسنِ فطرت کی غماز ہے۔ غالب نے اپنے مزاج کی شوخی شگفتگی کو اپنی تحریر میں سمویا ہے جس سے خطوط بڑے دلچسپ اور پُر لطف ہو جاتے ہیں۔ پُر مزاح جملوں کا انتخاب، برجستہ الفاظ اور موضوعات کے لحاظ سے ہنسی مذاق کے مواقع پیدا کرنا غالب کا کمال ہے۔ ہر شخص کے معیار کے مطابق مزاح کی چاشنی مکاتیب غالب کی اہم خصوصیت ہے۔ ان کی شوخیٔ تحریر نے نثر کو لطافت اور زندگی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں اسی شوخیٔ تحریر کے بارے میں لکھا ہے۔" مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہیں۔ اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ "ان کی اپنی شوخیوں اور شگفتگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے خطوط کو لکھتے ہوئے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا تھا کہ ان کا مکتوب الیہ ان کی تحریر سے خوش ہو اور مزے لوٹتا رہے ایک خط کسی دوست کو ڈسمبر ۱۸۵۸ء کی آخری تواریخ میں لکھتے ہیں۔ اور اس کا جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری جنوری کو دیا جاتا ہے چنانچہ اس کے جواب میں غالب رقم طراز ہیں کہ" دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے" ایک دوست کو رمضان میں خط لکھتے ہیں" دھوپ بہت تیز ہے روزے رکھتا ہوں مگر روزے کو

بہلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

سماجی شعور: غالب کے خطوط میں ایک سنجیدہ اور معیاری سماجی شعور اور آفاقیت کا رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے جو صرف ایک خالص انسانی جذبوں سے سرشار دل میں ابھر سکتا ہے۔ غالب نے زندگی کو ہمیشہ اپنے ذہن سے سوچا ہے اور اپنے فکری سرمایہ احساس اور جذبوں کو خطوط میں جذب کر دیا۔ جس سے ان کے خطوط کی عظمت میں ادبی شان پیدا ہو گئی۔

غالب کے خطوط آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی جن میں خود ان کے بارے میں ان کے دوستوں عزیزوں کی زندگی کے حالات ملتے ہیں۔

شخصیت خطوط کے آئینہ میں: غالب کے خطوط سے ان کی زنگار رنگ اور پہلو دار شخصیت کے مختلف گوشے روشن ہوتے ہیں ان خطوط میں غالب کی زندگی کے تمام گوشے نہ صرف روشن ہو جاتے ہیں بلکہ جو کچھ انہوں نے محسوس کیا اور جو کچھ ان پر بیتی ہے۔ ان سب کی تفصیل ان خطوط میں نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے مشاہدے تجربے، اور زندگی کی صداقتوں کو ان خطوط میں سمویا ہے۔ یہ خطوط غالب کی انفرادی داخلی زندگی اور ان کے آس پاس کی اجتماعی خارجی زندگی کے نشیب و فراز کے مرقعے ہیں ان خطوط میں غدر کی بے کیف زندگی بھی ہے، دربار کی بزم آرائیوں کے فسانے بھی اور نئے حالات نئی تہذیب کے حقائق بھی ملتے ہیں۔ غالب نے اپنے دور کے مختلف سیاسی، معاشی اور سماجی رجحانات کا ان خطوط میں حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔

بقول عبادت بریلوی کہ

"یہ خطوط تاریخ بھی ہیں اور سماجیات کی ایک کتاب بھی پھر سیاست کا ایک دلچسپ باب بھی اور معاشیات کا پر مغز مرقع بھی ہیں۔

غالب نے ان خطوط میں انیسویں صدی کے واقعات، دلی کی زندگی کے نشیب و فراز، قدیم و جدید اقدار کا تصادم، مختلف فرقوں کے خیالات، معاشی بے اطمینانی سے رونما کردار کی پستی، بے عملی اور معاشرے کی دیگر برائیوں کو واضح کیا ہے۔ ان خطوط کی سب سے زیادہ اہمیت ان کی بے باک صداقت ہے۔ غالب نے اپنی شخصیت کو پر اثر بنانے کی کبھی بھی کوشش نہ کی انہوں نے اپنی مے نوشی کو چھپایا نہیں جبکہ اس کا چھپانا مناسب تھا۔ انہوں نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کے اظہار میں پس و پیش نہیں کیا۔ حالانکہ انکی مخالفت ہر گوشے سے کی جا رہی تھی اپنے دور کے جدید نظام کی تائید میں انہوں نے اپنا قلم اٹھایا جبکہ دوسرے لوگ اعتراضات کو بہتر خیال کرتے تھے وہ دنیا کے نشیب و فراز دیکھتے تھے اور دوسرے دل کو اس کا مشاہدہ کرانا چاہتے تھے انکی شخصیت کے یہ جاندار پہلو ان کے خطوط میں نمایاں ہیں۔

غالب کی انسانیت دوستی، ان کی الجھنیں، لغزشیں، ذمہ داری کے لئے جدوجہد، کنبہ پروری، اپنی خامیوں پر ہنس لینے کا جذبہ، زندگی سے آخر دم تک لڑنے، مایوس ہونے کے بعد عزم تازہ پیدا کرنے کا حوصلہ دہلی کی بساط الٹ جانے پر دوستوں سے خط و کتابت، شکوے گلے، اشعار کی اصلاح اور دیگر بے شمار واقعات کا ذکر ان خطوط کو سدا بہار بنا دیتا ہے۔

آل احمد سرور کے الفاظ میں "اردو میں یہ پہلے خط ہیں جو مضمون نہیں فن ہیں جن میں لفاظی اور انشاپردازی کا جنون نہیں جس میں زبانِ قلم سے ہجر کو وصال

بنایا گیا ہے۔

امرا اور شرفا کی مجبوریاں، درباروں کی زندگی، مغلوں کے زوال کے اسباب اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے اثرات سیاسی تبدیلیاں، علمی ادبی تحریکوں کے پس منظر اور روداد یں، شاعرانہ ماحول کی خصوصیات، ادبی مباحث کے تذکرے ہندوستان کی مکمل زندگی کی حقیقی تصویر یں ان خطوط میں ابھرتی نظر آتی ہیں۔ غالب نے اپنے دور کے تمام سیاسی، سماجی، معاشی حالات کا جائزہ لیا ہے وہاں انہوں نے خطوط کو تاریخ کے خشک متنوں کی طرح غیر دلچسپ نہیں بنا دیا ہے بلکہ وہ نجی باتوں میں سیاسی سماجی حالات کا ذکر کر گئے ہیں غالب نے جو باتیں دوسروں کے لیئے بیان کی ہیں وہ ہر انسان سے وابستہ ہو جاتی ہیں اس طرح غالب کے خطوط آفاقیت کا پیکر بن جاتے ہیں۔

انہوں نے ذاتی حالات اور ماحول کی کیفیات کو بیان کر کے کمال حاصل کیا ہے۔ انہوں نے ڈرائیڈن کی طرح آخری عمر میں نثر کی طرف زیادہ توجہ کی اور اسے ادبی شاہکار کی حیثیت دی۔

تاریخی اہمیت: غالب کے خطوط ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اس دور کے نشیب و فراز سے واقف ہونے میں مدد ملتی ہے غالب نے تاریخی حالات کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ تاریخ کی خشکیوں پر انکے اسلوب کی شگفتگی نے انھیں دلچسپ بنا دیا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے غدر کے بعد دہلی کی زندگی کے حقیقی خدوخال کی موثر داستان ان خطوط میں جھلکتی نظر آتی ہے۔

غالب نے دہلی کی مٹتی ہوئی تہذیب اور ایک سسکتے ہوئے تمدن کا اپنی بصیرت افروز نگاہوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے شعور کی بلندیوں سے

محسوس کیا وہ قلعہ کے مستقبل سے مایوس تھے۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ "میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا، اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اسے دوام کہاں، کیا معلوم اب کے نہ ہو، اور اب ہو تو آئندہ نہ ہو۔"

غالب کے قلب و ذہن پر دہلی کی تباہی و بربادی کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اُن کے اکثر خطوط میں اُن کا یہ شدید درد جھلکتا نظر آتا ہے۔ لال قلعہ کی محفلوں کا درہم برہم ہونا اُن کے لئے عظیم سانحہ تھا انہوں نے نادر شاہی کے قتل کے خونین مناظر دیکھے اور خطوط میں دکھائے ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ نے دہلی کے چند حصوں میں جس میں غالب کا وہ کوچہ جس میں ان کا مکان تھا۔ اسکی حفاظت کی اس کا بھی ذکر ان خطوط میں کیا ہے اس طرح خطوط غالب تاریخ ہند کا ایک دستاویز ہے۔ جس کو غالب نے بڑی اثر آفرینی سے پیش کیا ہے۔

غالب کی شاعری جہاں حسن اور خوبصورتی سے لبریز ہے۔ وہاں ان کی نثر بھی منفرد اور دلکش خصوصیات رکھتی ہے۔ نثر میں انہوں نے جمالیاتی طرز سے گریز کرتے ہوئے موضوع اور مواد کا خوبصورت امتزاج پیدا کیا ہے اُردو نثر میں غالب کا سرمایہ اُنکے خطوط ہیں جو کسی پلان یا ادبی تجربے کی بنیاد پر نہیں تحریر کئے گئے۔ پھر بھی اُن میں ادبی نثر کی شان اور عظمت موجود ہے

ان خطوط میں مختلف مقامات پر ادبی تجربے کئے گئے ہیں۔ وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تجربے غالب کی فطرت اور مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے زندگی کے عام تجربوں کو ادب کے سانچے میں ڈھال دیا ہے انہوں نے اپنی ذہنی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر ان میں زندگی کی حرارت اور دلآویزی پیدا کی ہے ادبی رنگ و آہنگ نے ان خطوط میں دلچسپی اور دلکشی پیدا کی ہے۔ غالب کے خطوط ادبی شہ پارے ہیں جن میں سادگی،

سلاست، برجستگی کے جوہر ملتے ہیں۔ ان خطوط کا بیان فطرت کا آئینہ دار ہے
پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ "غالب کے خطوط نے سرسید اور
حالی کو نثر لکھنا سکھائی۔ ان خطوط میں روزمرہ زندگی کے گریز پا لمحات کو اس طرح
اسیر کیا گیا ہے جیسے شیشے میں پری اتر آئی ہو اس میں وہ غالب ملتا ہے۔
جو "آزاد و خود بین" ہوتے ہوئے بندگی کے آداب بجا لانے پر مجبور رہے جو
افلاک کی سیر بھی کرتا ہے اور سیدھے سبھاؤ زمین پر ہموار قدم سے چلنے کے لئے
بھی مجبور رہے جیسے سخت واقعے میں بھی جان عزیز رہی ہے جو دوسروں
پر ہی نہیں اپنی امیدوں اور حسرتوں پر بھی ہنس رو سکتا ہو جو الفاظ کے مزاج
کو پہچانتا ہے جو ان میں کبھی شمشیر کی سی تیزی پیدا کرتا ہے کبھی پھولوں کی سی
تری اور لطافت کبھی شراب کی تندی و تیزی۔ کبھی جوئے کوہستان کا جلال
کبھی نہر کے پانی کی سی روانی کبھی فوارے کا سا جوش و خروش کبھی پھوار کا سا
لطف و کیف جیسے ہنسانا، رلانا، بے خود بنانا۔ ہوش میں لانا، عبرت دلانا، بصیرت
عطا کرنا سب کچھ آتا ہے جو ہمیشہ مزے دار، جاندار اور پہلو دار بات کہتا ہے۔
جس کی سیدھی بات پر سو تکلف اور جس کے ایک ٹھٹھول پر سو مضمون قربان ہیں"۔
غالب کے خطوط اردو نثر کا ایک نادر و دلکش مرقع ہی نہیں، بلکہ لازوال سرمایہ ہیں
جنکی اہمیت ناقابل انکار حقیقت ہے۔

ہندوستانی تہذیب اور امیر خسرو

امیر خسرو ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب اور اس کے پُر عظمت تمدن کے نقیب ہیں۔ اُن کی شخصیت اور شاعری میں اس ملک کی لسانی، تہذیبی اور قومی زندگی کے خد وخال نمایاں نظر آتے ہیں انھوں نے ہندوستان کے ذرہ ذرہ سے بے پناہ محبت کی اور اس بات پر فخر محسوس کیا کہ اُن کا ملک دنیا کے تمام ملکوں سے اپنی بے شمار خصوصیات کے اعتبار سے بلند حیثیت کا حامل ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں

'کشورِ ہند است بہشتی بزمین'

خسرو نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے بڑے دلچسپ اور گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اپنی مشہور طویل نظم 'نہ سپہر' میں وہ ہندوستانی مذاہب، زبان، فلسفہ وحکمت، عقاید و تصورات اور تہذیب سے متعلق ساری خصوصیات بیان کرتے ہوئے اپنے ملک کی تہذیب اور اس کے تمدن کی ترجمانی کرتے ہیں۔

تیرھویں صدی کے اس عظیم شاعر نے زندگی کی مختلف جہتوں کو متاثر کیا ہے ان کی شاعری تیرھویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی تصویر ہے۔ اس دور کے سیاسی، سماجی اور دیگر حالات کو خسرو نے شاعری کی زبان دی ہے۔

امیر خسرو اُردو زبان کے اولین شاعر ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ اُردو الفاظ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کیئے۔ اور اس زبان میں شاعری کی۔ اُردو کی سب سے پہلی غزل امیر خسرو نے ہی کہی ہے۔ خسرو نے شاعری کی کائنات کو لامتناہی وسعت دی۔ قصیدہ، مثنوی، غزل اور مرثیہ سب ہی اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنی شعری عظمت اور فنی صلاحیت کا ثبوت پیش کیا۔ اپنی ان شعری خوبیوں کے باعث غزل میں سعدی کے ہم قدم اور مثنوی میں نظامی ثانی کہلائے گئے۔ خسرو کی شاعرانہ بصیرت اور حسنِ فکر کے باعث انھیں 'طوطیٔ ہند' کا خطاب حاصل ہوا۔ ایران کے اہلِ علم و ادب نے بھی اس ہندوستانی سخنور کی بے پناہ تنقید کی

ہے۔ ان کی شاعری اور علمی برتری سے متاثر ہو کر جلال الدین خلجی نے انھیں امیر کا خطاب دیا تھا۔

عام شعرا کی طرح خسرو نے صرف فکرِ شعر کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد نہیں سمجھا بلکہ زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دی۔ شاعری اور زبان میں بیشتر اختراعات دراصل خسرو کے رہینِ منت ہیں فارسی کے مزاج شاعری سے دامن بچاتے ہوئے اردو شاعری میں نئی نئی تشبیہات وضع کیں اس کے لیے انھوں نے برج بھاشا سے بھی مدد لی اور اُردو میں روایت و تقلید پرستی کے رجحانات ختم کئے۔

خسرو نے شاعری اور فنِ شعر پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے عزۃ الکمال میں انھوں نے شاعری کے بارے میں جس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی ناقدانہ بصیرت اور فکر رسا کا پتہ چلتا ہے۔ شاعر کی خصوصیات اور استاد سخن کے بعض لوازم کا ذکر کرتے ہوئے خسرو نے اپنی شاعری کے متعلق خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ کسی خاص طرز کے موجد نہیں ہیں۔ ان کی یہ بیباکانہ رائے اور دیانت دارانہ رویّہ ان کے تنقیدی شعور کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے عربی پر فارسی شاعری کو ترجیح دی ابتداء میں خسرو نے اپنا تخلص سلطانی رکھا بعد کو خسرو اختیار کیا۔ تحفۃ الصغر میں انھوں نے اپنا تخلص سلطانی ہی استعمال کیا۔

خسرو کی مثنویوں میں خاص طور پر ہندوستانی تہذیب و تمدن کی روح بولتی نظر آتی ہے۔ اکثر مثنویوں کا پس منظر ہندوستانی معاشرت ہے جن میں درباری زندگی، سماجی کشمکش اور انسانی و اخلاقی معیارات کی عکاسی کی گئی ہے۔

رزمیہ۔ عشقیہ۔ اور صوفیانہ موضوعات پر مشتمل ان کی مثنویاں ہماری تہذیبی و تمدنی زندگی کی گویا تاریخ ہیں۔ معمولی واقعات، بادشاہوں کی مصلحت پسندیوں کے قصّے، اقتدار کے لیے رسہ کشی اور دیگر بے شمار اُمور پر قلم اٹھاتے ہوئے خسرو نے کہیں بھی تاریخی حقائق کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انھوں نے اکثر مثنویاں بادشاہوں کی فرمائش پر لکھی ہیں لیکن اس میں جن واقعات اور حالات

کا ذکر ہے ان سے ان کی شاعرانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کے تاریخی ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ ہند کے مولف کے لیے خسرو کی ان مثنویوں کا مطالعہ ناگزیر ہوگا جن میں درباروں کی زندگی، خلوت و جلوت کے معاملات جذبات و احساسات اور بادشاہوں کے اندازِ فکر کا جگر چاک کیا گیا ہے۔ خسرو نے جملہ (۹۲) کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں نظم و نثر کے علاوہ فنِ موسیقی اور علم حساب پر بھی بعض تصانیف شامل ہیں۔ تغلق نامہ، تاج الفتوح، دول رانی و خضر خاں افضل الفوائد، خزاین الفتوح، نہ سپہر، تاریخ دہلی اور مناقب ہند، خسرو کی وہ تصانیف ہیں جن میں اس دور کے حالات بے کم و کاست پیش کیے گئے ہیں۔ خسرو کی غزل کے مقابلہ میں ان کی مثنویوں کا رنگ اتنا واضح اور دلچسپ نہیں ہے لیکن پھر بھی ان میں جو واقعات سموئے گئے ہیں وہ ان کے شاعرانہ کمال کی خوبی ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ خسرو کا مزاج غزل سے ہم آہنگ تھا لیکن اس کے باوجود ان کی بعض کامیاب مثنویوں کو پڑھ کر اس خیال کی تردید ہوجاتی ہے۔ ان کی شاعری میں اکثر آورد سے زیادہ آمد نظر آتی ہے کہیں کہیں آورد بھی نمایاں ہے۔ خسرو کے دور میں اگرچہ زبان کو پختگی اور گیرائی حاصل نہیں تھی لیکن اس کی ترقی کے روشن امکانات پیدا ہو چلے تھے۔

خسرو نے مروجہ دیسی بولیوں کو اپنی شاعری میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو جو مقامی رنگ (LOCAL COLOUR) دینے کی کوشش کی ہے اسے اردو میں ایک کامیاب کوشش قرار دیا جاسکتا ہے چنانچہ اپنی نظم "خالق باری" میں خسرو نے جن الفاظ کو استعمال کیا ہے وہ اب بھی مروج ہیں جیسے ایک، کالا، میٹھا، تالا، آس، سکھ، گھوڑا چلاؤ وغیرہ خسرو نے فارسی اور ہندی کے علاوہ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کیئے جا سکتے ہیں۔

خوار شدم زار شدم ست گیار
در غم ہجر تو کمر ٹوٹا ہے

روئے تو رونق شکن آفتاب
سرو بہ پیش قد تو لوٹا ہے

انھوں نے اپنے پیروؤں کو فارسی اور ہندی کے علاوہ اردو میں شاعری کی ایک نئی راہ اور نئی جہت سے روشناس کیا۔ ادب اور زبان کی یہ عظیم خدمت ناقابلِ فراموش ہے۔

اُردو نثر نگاری میں بھی خسرو نے بلند پایہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس دور میں نثر نگاری کے اصول و قواعد مدوّن نہیں ہوئے تھے جس سے ایک طرح کی دشواری پیدا ہوگئی تھی خسرو نے اعجاز خسروی میں نثر کے اصول و قواعد بیان کئے اور اپنی ذہانت طبع اور مہارت زبان کا واقعی اعجاز دکھایا ہے۔

زبان و ادب تہذیب کا خاصہ ہوتے ہیں خسرو نے اس ہندوستانی زبان کی آبیاری کرکے جو اس کی نشوونما میں معاون ہوئی اس ملک کی تہذیب اور زبان سے کامل وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔

خسرو نے اپنی شاعری کے ذریعہ زبان وادب کے علاوہ ہندوستان کے مذہبی عقائد و تصورات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ وہ ہندوستان کے بے شمار مذاہب کو دنیا کی ایک انوکھی مثال قرار دیتے ہوئے اسے ہندوستان کی انفرادیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں وحدت، ہستی، قدامت نیک اعمال سے متعلق تصورات میں کچھ نمایاں فرق نہیں ہے لیکن مذہبی اعمال و اشغال مختلف ہیں۔

خسرو نے ہندو مذہب کا دیگر فرقوں کے عقاید سے تقابل کیا ہے نیز ہندوؤں کی بعض ذاتوں کے بنیادی فرق کو واضح کیا ہے۔ ہندوستانی مذاہب پر ان کی گہری نظر ہے جن کا انھوں نے گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے تصوف کو جو ہندوستانی مزاج میں خوابیدہ تھا بیدار کیا۔ موسیقی اور سوز و ساز ہندوستانی عوام کے خمیر میں داخل ہے۔ چنانچہ اس ذوق کی تکمیل اور اس

کو بامقصد بنانے کے لیے خسرو نے فن موسیقی میں زندگی کا سوز و ساز پیدا کیا اور اس کو محض آواز اور لئے کی بے ڈھنگی سے نکال کر اس میں عشق و محبت اور معرفت کی زندہ کیفیات پیدا کر دیں۔

خسرو کی شاعری نے جہاں قلب و ذہن کو متاثر کیا ہے وہاں وہ اُن کی صوفیانہ عظمت روح کی گہرائیوں تک پہنچی۔ ان کے اشعار پر ہندو مسلمان اور تمام دیگر اقوام سر دھنتی رہیں۔ معرفت الٰہی اور عشق حقیقی سے معمور ان کی پرکشش شخصیت نے سب کو ان گرویدہ بنا لیا۔ یہہ کیفیت دراصل حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے فیضِ کرم کا نتیجہ ہے جس کا خسرو نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ۶۵۹ ۱۲ سنہ ہجری میں حضرت خواجہ محبوب الٰہیؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے اور مرید صادق کی حیثیت سے یہہ وابستگی وہ رنگ لائی کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ قیامت میں ان سے اگر خدا سوال کرے گا کہ وہ کیا لائے ہیں تو وہ خسرو کو اس کے جواب میں پیش کر دیں گے۔ اس سے محبّت اور وابستگی کے ساتھ ساتھ خسرو کی عظمت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی خوبیوں کے مالک تھے کہ انھیں حضرت خواجہ جیسی بلند پایہ ہستی حضور خداوندی میں پیش کرنے کی خواہاں ہے۔ حضرت نظام الدینؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے تو خسرو نے درباروں کی حاصل کردہ ساری کمائی لٹا دی تاکہ معرفت و روحانیت کی دولت سے مالا مال ہو جائیں طوطئ ہند خسرو کو اب حضرت نظام الدینؒ سے ترک اللہ کا خطاب عطا ہوتا ہے اور ان کے لیے یہہ دعا بھی کی جاتی ہے کہ

'الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا ببخش'

خسرو کی صوفیانہ عظمت اور شاعرانہ برتری کا راز دراصل اِس الطاف کریمانہ کا حسن فیض ہے کہ علامہ شبلی کہتے ہیں 'امیر صاحب کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے وہ اسی وادی ایمن کی شرر باریاں ہیں'۔

ہندوستان کے اس وطن پرست صوفی، مغنی اور مطرب شاعر نے

عشق الٰہی کی چنگاریوں کو شعر میں جذب کرلیا اور سوز و ساز کے ذریعہ قلوب کو گرما دیا ۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ہندوستان میں موسیقی کا رواج ہے ضرورت محسوس کی کہ مذہب اور زبان و ادب کی اشاعت کے لیے موسیقی کو واسطہ بنایا جائے تاکہ عوام کے ذہن و فکر کی تعمیر اور قلب کی اصلاح ہو ۔ چنانچہ انھوں نے فنِ موسیقی میں کمال پیدا کیا اس دور کے مشہور استادِ موسیقی نایک گوپال سے علاء الدین خلجی کے دربار میں ان کا مقابلہ ہوا ۔ خسرو ہر راگ میں گوپال سے بازی لے جاتے یہاں تک کہ آخر میں نایک گوپال امیر خسرو کی ماہرانہ اور فنی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی موسیقی کا پرستار بن گیا ۔ خسرو نے فارسی راگ ہی نہیں بلکہ بے شمار ہندوستانی راگوں سے واقفیت حاصل کرکے ان کے حسین امتزاج سے فنِ موسیقی میں نئے نئے راگوں کو ایجاد کیا ایک جگہ کہتے ہیں

نام راگھائے مخترع امیر خسرو

کن راگوں سے مرکب ہے

ان راگوں میں سازگری ، باخرز ، عشاق اور موافق قابلِ ذکر ہیں ۔ خسرو کی موسیقی کا پس منظر ہندوستان تھا انھوں نے فارسی راگوں کو ہندوستانی سوز دے کر مزین کرکے جو نئے راگ پیدا کئے اس میں ہمارے ملک کی تہذیب تمدن ، تصوف اور اندازِ فکر کی چاشنی ملتی ہے ان راگوں کا حسنِ صوت نہ صرف کانوں کے لئے بلکہ قلب و نظر کی پاکی کے لیے بھی سود مند ہے ۔

خسرو نے ہندوستانی زبان و ادب ، تصوف ، موسیقی کے علاوہ اس ملک کی اعلیٰ علمی خصوصیات کا ذکر کیا ہے ۔ علم ، حکمت ، فلسفہ و سائنس ریاضی ، نجوم ، منطق ہیئت اور دیگر بیشتر ... در اصل ہمارے ملک کی دین ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ جو مذہب ، موسیقی ، سیاست اور معاشرت پر مشتمل ہے

اس ملک کی دین ہے کلیلہ ودمنہ جیسی گراں مایہ فلسفہ و حکمت سے معمور کتاب جس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ہندوستانی تصنیف ہے ہندوستانی بادشاہوں تک کھیل شطرنج کا بالکلیہ طور پر یہاں آغاز ہوا۔ اور ساری دنیا میں اسے شہرت حاصل ہوئی۔ اپنی نظم "نہ سپہر" میں خسرو نے ہندوستان کو علم فلسفہ زبان، مذہب، موسیقی، تصوف اور فنون لطیفہ کا عظیم مرکز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی اس ساحرانہ عظمت نے ساری دنیا کو مسحور کر لیا ہے۔ خسرو نے ایک وطن پرست مسلمان کی حیثیت سے اپنے ملک سے بے پناہ محبت کی اور وطن کی محبت کو ایمان کا جزو قرار دینے والے اس ارشاد پر گہرے ایقان کا اظہار کیا۔ وہ کہتے ہیں۔

دین ز رسول آمدہ کالی زمرہ دین
حب وطن ہست ز ایمان بہ یقین

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے مطابق اے دین دار وطن سے محبت رکھنا ایمان کا یقینی جزو ہے)

خسرو نے ایک وطن پرست شہری کی حیثیت سے اس ملک کے موسموں کی کیفیات پھلوں اور پھولوں کے جاذب نظر حسن، ہندوستانی پارچہ کی نمایاں خصوصیات پرندوں کی بولیوں، دیگر ہندوستانی جانوروں کی ان گنت خوبیوں کو اشعار میں پیش کیا ہے۔ دہلی جو اس ملک کا دل ہے اس سے بھی خسرو نے پیار کیا ہے۔ اور اسے باغ ارم سے تعبیر کیا ہے۔ اس شہر کی بلند پایہ شخصیتوں، پرشکوہ عمارتوں اور خوبصورت شاہراہوں سے تک خسرو کو گہرا لگاؤ رہا ان تمام احساسات و جذبات کو خسرو نے اپنے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ ہندوستان کا قومی پرندہ مور، طوطا ان کی نظر میں بے مثال ہیں۔ "پان" کو وہ ہندوستانیوں کے لیے قدرت کا تحفہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح متعدد ہندوستانی خصوصیات کا خسرو نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔

انھیں اس ملک کا شہری ہونے پر ناز ہے ۔ اور اس پر فخر کرتے ہوئے دیگر ممالک مثلاً روم، عراق، خراساں پر ہندوستان کو ترجیح دیتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں کہ ہندوستان کی عظمت کی ایک وجہ خسرو کا وجود بھی ہے اس جیسا سحر البیان دوسرے ملکوں میں نہیں ملتا ۔ اس بناء پر ہی اسے طوطیٔ ہند کہا جاتا ہے ۔

امیر خسرو نے ہماری زبان ادب عقاید و تصورات، فنون لطیفہ کی جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کے صفحات اور ہمارے حافظے میں محفوظ ہیں ۔ انھوں نے ہر مذہب اور عقیدے کے لوگوں سے محبت کی ۔ اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس محبت کو پیوست کرلیا ۔ یہی احساس پھوٹ کر اُن کی شاعری میں جلوہ گر ہوتا ہے ۔ ہمارا ملک طوطیٔ ہند کے نغموں سے مترنم ہے ۔ جس کی فضا میں پورا ہندوستان بسا ہوا ہے ۔

خسرو کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں زبان زد خاص و عام ہیں ۔ ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب اور قومی یگانگی کا مظہر ہے ۔ خسرو نے معرفت و محبت الٰہی کے ذریعہ ہماری بصیرت و بصارت کو روشن کیا ۔ اپنی شاعری موسیقی، نثر نگاری اور سب سے بڑھ کر اپنے افکار و خیالات اور شخصیت کے ذریعہ خسرو نے ایک عہد کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ۔ وہ ہندوستانی تہذیب کی ایک علامت ہی نہیں ایک منارۂ نور ہیں جن کے ذریعہ ہم اپنے دلوں میں وطن کی محبت اور معرفت و محبت الٰہی کی روشنی اور حرارت پیدا کرسکتے ہیں ۔

اُردو نثر کا شاہکار سب رس

سب رس اُردو نثر نگاری کا شاہکار ہے ۔ وجہی نے اپنے اس نثری کارنامہ میں زندگی کے تمام رس (جذبات) سمو دیئے ہیں ۔ انھوں نے اپنی تصنیف میں جو مواد پیش کیا ہے وہ عشق و معرفت تصوف و محبت کے مضامین پر مشتمل ہے ۔ لیکن وجہی کا مقصد اسے ایک عظیم و بے مثال ادبی کارنامہ کی حیثیت سے پیش کرنا تھا ۔ چنانچہ انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا وہ اظہار بیان کا ایک خوبصورت اور کامیاب ادبی تجربہ ہے ۔ زبان اپنی قدامت کے باوجود فہم ' لطافت اور حرکت و حیات سے معمور ہے ۔ وجہی کی اس شاندار ادبی کوشش نے اُردو نثر کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا ورنہ اس سے قبل نثر کو صرف اظہار مدعا کا ذریعہ تو بنایا گیا لیکن اس کا دامن اسلوب کے حسن ' انشا پردازی کے جوہر اور طرز بیان کی موزونیت و دلکشی سے خالی تھا ۔ اس کے علاوہ سب رس سے پہلے کے نثر پاروں کی کوئی مسلمہ ادبی حیثیت نہ تھی ۔ سب رس ہماری زبان و ادب کا ایک خوشگوار موڑ ہے جہاں سے نثر نگاری نے پوری حوصلہ مندی اور توانائی کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کیں ۔ وجہی نے سب رس میں زندگی کے تمام رس نچوڑ دیئے ہیں ۔ انھوں نے مذہب ، کائنات ، انسان اور دنیاوی دینوی زندگی کے بے شمار رازِ سربستہ کا جگر چاک کیا ہے وہ بیک وقت ادیب ، شاعر خطیب فلسفی ' ماہر نفسیات اور ایک دردمند انسان کے روپ میں نظر آتے ہیں سب رس میں ، زندگی اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ رواں دواں ہے اور کہیں پر بھی ہم جذبہ ' احساس ، فکر اور شعور کی کم مائیگی کا احساس

نہیں کر پاتے خود وجہی کا دعویٰ ہے کہ

'اگر کسی میں سخن شناسی ہو' اسرار دانی ہے تو یو کتاب
گنج العرش بحر المعانی ہے۔ جیتا کوئی طبیعت کے کواڑ
کھولے گا' اس کتاب میں نیں سو بات کیا بولے گا۔
جو کچھ آسمان ہور زمین میں ہے سو اس کتاب میں
ہے۔ جو کچھ دنیا ہور دین میں ہے سو اس کتاب میں ہے'

وجہی کے قلم کی روانی نے ایک داستان کو تمثیلی پیرہن دے کر اس میں زندگی کی لہر دوڑا دی زندگی کے مشاہدات اور تجربات نے اس کی فکر و نظر کو جن وسعتوں کا حامل بنا دیا تھا انھیں وجہی نے اپنی 'شعری نثریت' میں سمو دیا ہے اس کا ایک ایک بیان خود مستقل مضمون اور اس کے پس پردہ ندرتِ فکر کی گہرائی و گیرائی ہمارے قلب و ذہن کو روشنی اور حرارت دیتی ہے۔ وجہی نے لکھا ہے۔

'غرض بہوت نادر نادر باتاں بولیاں ہوں دریا ہو کر موسا
موتیاں رولیا ہوں'

ملا وجہی عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اس نے شعر اور نثر میں کمال حاصل کیا۔ اس نے اپنی یہ تصنیف بادشاہ کی خواہش پر لکھی سب رس کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ بتایا جاتا ہے۔ وجہی نے فتاحی نیشاپوری کی کتاب 'دستور عشاق' اور 'قصہ حسن و دل' سے یہ قصہ اخذ کیا لیکن زبان و بیان اور جدت اسلوب سے اس قصہ کو ایسا رنگ دے دیا کہ نقل پر اصل کا یقین ہونے لگتا ہے۔

سب رس مواد اور اسلوب کے اعتبار سے بلاشبہ اردو نثر کا ایک بلند پایہ کارنامہ ہے۔ وجہی نے عقل اور عشق کے تصادم کو نہایت خوبی سچائی اور فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔ صفات کو مجسم بنا کر

انسانی جذبوں کی حقیقی ترجمانی وجہی کا کمال ہے۔ قصہ میں عقل ریاست سیستان کا بادشاہ ہے جس نے اپنے بیٹے دِل کو ملک تن کی ریاست حوالے کردی ایک رات دِل نے آبِ حیات کا واقعہ سنا جس سے اس کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ آبِ حیات سے وہ بھی مستفید ہو۔ چنانچہ دِل نے نظر نامی جاسوس کو آبِ حیات کی تلاش میں روانہ کیا آخر کار نظر ایک ایسی ریاست میں پہنچا جہاں کا بادشاہ عشق ہے۔ اس بادشاہ کی خوبصورت لڑکی حسن ہے۔ بادشاہ کی ریاست کے قریب ایک شہر دیدار ہے جس کے باغ 'رخسار' میں آبِ حیات موجود ہے۔ نظر نے دِل کو اس کی خبر دی دل شہر دیدار جہاں حسن سے اس کی ملاقات ہوئی دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے عنبر نے دو محبت کرنے والوں کے درمیان رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عقل اور عشق بادشاہوں کے درمیان معرکہ ہوا آخر کار حسن و دل کی شادی پر مصالحت کی گئی۔

وجہی نے بظاہر اس معمولی قصہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کا تمثیلی پیرایۂ بیان نہایت اعلیٰ ہے۔ سب رس کو تمثیل ALLEGRY قرار دیا جاتا ہے۔ تمثیل انشا پردازی کی ایسی قسم ہے جس میں انسانی جذبات غصہ، نفرت، محبت یا کسی تشبیہ و استعارہ کو مجسم متصور کرکے کوئی قصہ بیان کیا جائے ان قصوں کے تحریر کرنے کا مقصد اخلاقی و اصلاحی درس دینا ہے۔ سب رس میں بھی عشق، حسن، عقل اور دل کی مختلف کیفیات اور نفسیاتی کشمکش کو متحرک کرداروں کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ وجہی نے اپنی فنی مہارت کے ذریعہ کرداروں کے نام اس طرح دیئے ہیں کہ ہم بآسانی ان کے مزاج اور خصوصیات سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وجہی نے عشق و محبت کی اس داستان کو معرفت و محبت کی مئے سے سیراب کردیا ہے۔ انھوں نے تصوف کے مدارج اور سلوک کے راستوں کی

نشاندہی کی ہے جس میں دیدار الٰہی کے لیے ایک سالک کا اضطراب، پیہم آزمائشوں اور رکاوٹوں کا سلسلہ دراز، وصال حق کی منزل اور پھر مقام لقا تک رسائی شامل ہیں۔ وجہی نے تصوّف کے مقامات و مراحل کو سمجھاتے ہوئے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ ہم یوں محسوس کرتے ہیں کہ وجہی ان مقامات کو سمجھا نہیں رہے ہیں بلکہ اُن کی سیر کرا رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ داستان عشق مجازی کے تمام مرحلوں کا احاطہ کرتی ہے۔ عشق پر مظالم، حسن کی مجبوریاں، عشق و عقل کی کشمکش، رقیب کی ریشہ دوانیاں، فراق و وصال اور دیگر احساسات و نفسیاتی کیفیات کو وجہی نے الفاظ کے ذریعہ زندہ و متحرک کر دیا ہے۔ اُن کی واقعہ نگاری فن کی معراج کو چھوتی نظر آتی ہے۔

سب رس میں وجہی نے منظر نگاری اور سراپا نگاری کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ صبح کا منظر اور حسن و دل کی شادی کا گویا وہ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں، حسن کا سراپا بیان کرنے میں بھی اُنھوں نے بڑی باریک بینی اور ذوقِ جمال کا ثبوت دیا ہے۔ سب رس ایک تمثیلی داستان ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں وجہی نے درباروں کی حالت، معاشرہ کے اقدار، شراب نوشی، شادی بیاہ کے طریقے، پردہ کی پابندی اور دیگر بے شمار سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے

وجہی کی زبان تین سو برس سے زاید قدیم ہے لیکن اس دور کے اعتبار سے انھوں نے نہایت بامحاورہ فصیح اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے اس زبان سے اگر کوئی واقفیت حاصل کرلے تو اُن کی تحریر کی لطافتوں اور باریکیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ انھوں نے اپنی تحریر میں اثر اور روانی پیدا کرنے کے لیے ہندوستان کی تقریباً سب ہی زبانوں کو استعمال کیا ہے۔ ہندی کہاوتیں، گوالیاری دوہے، دکھنی و شمالی ہند کی زبان ضرب الامثال، محاورے، آیاتِ قرآنی، احادیث کا نہایت موزونیت

کے ساتھ استعمال کیا ہے اس لیے بھی وجہی نے اپنی زبان کو دکھنی کی بجائے ہندی کہا ہے ۔ انھوں نے ہندی سے مراد ہندوستانی زبان لی ہے اس کے علاوہ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں ۔ وجہی نے فارسی الفاظ سے بعض مصادر تراشے ہیں ۔ جیسے اندیشدن سے اندیشنا ، تلاشیدن سے تلاشنا وغیرہ ۔ انھوں نے قرآنی آیات ، احادیث ، کہاوتوں اور اقوال کے ساتھ بھی ہم قافیہ جملے استعمال کیے ہیں ۔ جیسے مبارک ہوکجا گئے تیرے نصیب ، کہ نصر من اللہ و فتح قریب وجہی کی زبان فصیح اور مسجع و مقفیٰ عبارتوں سے معمور ہونے کے باوجود ایک طرح کے بانکپن کی مالک ہے ۔ وجہی نے زبان کے لب ولہجہ میں مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے تبدیلی بھی پیدا کی ہے عقل و دانائی کی باتیں بتاتے ہوئے اُن کا انداز نہایت عالمی اور دانشورانہ ہوجاتا ہے ۔ بڑی متانت سے وہ علمی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں ۔ انھوں نے انداز بیان میں ایک ایسا زیروبم پیدا کیا ہے کہ اس کی نرمی و گرمی روشنی و حرارت سے قلب و ذہن معمور و متاثر رہتے ہیں کہ بعض مقامات پر وجہی خطابی انداز اختیار کرلیتے ہیں اور کہیں کہیں ایک صوفی صافی بزرگ کی طرح دل کی بات دل میں اتارتے ہوئے ملتے ہیں ۔ خود کلامی میں بھی اُن کے لہجہ کی تاثیر ہماری توجہ کو اُن کی جانب مائل رکھے رہتی ہے پورے قصہ میں لیکچر بازی کا گمان نہیں ہوتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وجہی قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے کے فن سے خوب واقف ہیں ۔ تحریر کے بدلتے سنورتے لب ولہجہ میں بھی ہم کو اپنائیت کا احساس ہوتا ہے ۔ سب رس میں نثر و شعر کا خوبصورت امتزاج ایک "ناگزیر عمل" بن گیا ہے وجہی نے بعض جملوں اور اپنی عبارت میں وہ قطعیت پیدا کردی

ہے کہ ان کے یہہ جملے بذات خود ضرب الامثال بن گیے ہیں۔ وجہی نے سب رس کو تمثیل، داستان اور انشائیے کا ایک فنکارانہ مرکب بنا دیا ہے کہ ہم کتاب کے بعض حصّوں کو علحدہ علحدہ کر کے انھیں داستان انشائیے اور تمثیل کا روپ دے سکتے ہیں۔ وجہی کے تجربات وحوادث نے ان کی فکر و نظر کو جس بصیرت سے مالا مال کیا تھا ان افکار کو اگر علحدہ شکل دیں تو اردو میں ان کی حیثیت کامیاب اور مستقل انشائیوں کی ہوگی۔

وجہی نے فارسی نثر کے اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ بالخصوص قافیہ کی مدد سے اُنھوں نے نثر لکھنے کا نہایت کامیاب تجربہ کیا۔ عام طور پر نثر میں قافیہ آرائی تحریر کو پر تکلف اور بوجھل بنا دیتی ہے لیکن وجہی کی نثر میں قافیہ کا اہتمام ہونے باوجود اس کی بے ساختگی برجستگی بے مثال ہے۔ وجہی کی تحریر میں آمد زیادہ ہے کہیں کہیں آورد کا بھی گمان ہوتا ہے۔ انھوں نے قافیہ کی دولت کو خوب فراخدلی سے لٹایا ہے۔ ان کا یہ اسلوب منفرد ہے خاص طور پر قافیہ کی مدد سے وجہی نے نثر کو شعر کا پیکر دے دیا ہے بعض مرتبہ خارجی حیثیت سے نثر پر شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے وجہی کا یہ انداز نثر کے تسلسل اور اس کی خصوصیات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جسے ہم وجہی کی فنی خامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ قافیہ پیمائی کے نتیجہ میں عبارت شکستہ دکھائی دیتی ہے۔ اور فقرے الگ الگ ہو کر نثر کو شعر کا روپ دیتے ہیں۔ بعض مرتبہ پورا قصّہ ایک 'مسلسل شعری استعارہ' محسوس ہوتا ہے۔ وجہی نے مصرعہ سازی کے شوق میں فقروں کو اسقدر مختصر کر دیا ہے کہ قصّہ کی روانی متاثر ہونے لگی۔ لیکن بعض مرتبہ طویل فقروں کو استعمال کرتے ہوئے وہ اپنی 'ذوق قافیہ پیمائی'

سے اجتناب کرتے ہیں ۔ وجہی نے سب رس میں نثر و نظم کو ملا کر اردو نثر میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی وہ لکھتے ہیں

'آج لگن کوئی اس جہان میں، ہندوستان میں ہندی
زبان سوں اس لطافت، اس چھنداں سوں نظم
ہور نثر ملا کر گلا کر یوں نیں بولیا'

وجہی کے اس دعویٰ کی بہترین دلیل ان کا نثری شاہکار سب رس ہے ۔جس میں نظم و نثر ملا کر گلا کر انھوں نے بڑے کامیاب اور دلچسپ تجربے کیئے ہیں ۔سب رس نثر سے زیادہ نظم کے قریب معلوم ہوتی ہے ۔ ان کا اسلوب بے مثال ہے ۔

وجہی نے تحریر میں صنائع و بدائع، مسجع ومقفیٰ عبارتوں، تشبیہوں و استعاروں، صنعت اور تکرار کا نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے ۔جس سے تحریر کی روانی، دلکشی تاثیر اور جاذبیت میں اضافہ ہوا ۔ وجہی نے سب رس میں انشا پردازی کا کمال بتاتے ہوئے داستانی حصّہ کو داخلی حیثیت سے اس قدر مربوط کر دیا ۔ کہ انھیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جاسکتا ۔ قصّہ کے دوران عقل و حکمت، تصوف و معرفت کی باتیں بیان کی ہیں ۔ اشعار کا استعمال کیا ہے اور فلسفہ و نفسیات کی گھتیوں کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد ہی وہ اصل قصّہ کی طرف رجوع ہوجاتے ہیں ۔ سب رس کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کا قلم خیالات کی تیز رو کے ساتھ رواں دواں ہے ۔ ان کی تحریر میں اس قدر آمد ہے کہ کسی بھی مقام پر بہت کم گمان ہوتا ہے کہ انھیں اپنے قلم کو کسی بھی لمحہ روکنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو ۔

سب رس میں وجہی نے 'یوں عجب نظم ہور نثر ہے جانو بہشت میں کا قصر ہے ۔ سطر سطر پہ برستا ہے نور، ہر اک بول ہے یک حور"

کا جو دعویٰ کیا ہے وہ اُن کی ندرتِ فکر، اسلوب، فنی محاسن، طرزِ تحریر
اور پیرایۂ زبان کے اعتبار سے صداقت پر مبنی ہے۔ انھوں نے تمثیل نگاری
وصف نگاری، داستان گوئی، انشاپردازی کو جو نثر و نظم کی ملی جلی شکل
میں سمویا ہے وہ اُردو نثر کا منفرد، ممتاز اور بہترین اسلوب ہے اور اسی
اسلوب کی بناء پر اُردو میں اس تصنیف کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ نثر
و شعر کے اس امتزاج کے باوجود قصہ کی آب و تاب تحریر کے تاثر اور روانی
میں جو فرق نہیں آتا وہ اس اسلوب کی بلند پایہ خصوصیت اور وجہی
کی فنی عظمت اور تخلیقی صلاحیت کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے صحیح
کہا ہے کہ وجہی نے دانش کا پہاڑ کھود کر ایک نیا اور بدیع اسلوبِ بیان
اُردو میں ایجاد کیا اور نظم و نثر دونوں کو ملا جلا کر بیان کا ایک نیا
راستہ نکالا کہ جس سے نثر میں شعر کا لطف پیدا ہو گیا۔

"اُردو ناول"

نذیر احمد سے پریم چند تک

انسانی زندگی ازل سے عیش وطرب، راحت وسکون کی طلب گار رہی ہے اپنی جہد مسلسل کی صعوبتوں اور آزمائشوں کی تپتی دھوپ میں بھی انسان نے تصور وتخیل کی آماجگاہ میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ تھکا دینے والی زندگی کی تلخیوں وحقیقتوں سے کچھ دیر فراریت حاصل کرنے کے لئے کہانیاں سننے اور کہانیاں سنانے کے دلچسپ مشغلہ میں وہ لذت وسرور کے مزے لوٹتا رہا۔ ماحول کی تند وتیز فضاؤں میں وہ اپنی احساس برتری کو بنائے رکھنے کیلئے ایک ایسا جہاں تازہ پیدا کرتا جس میں اسے خود فراموشی، تخیل، تصور اور رومان کے خزانے ملتے پھر ان تخیلاتی وتصوراتی کہانیوں نے اجتماعی زندگی میں قربتیں پیدا کیں اور دلوں کے فاصلے کم کئے۔ کہانی کا یہ تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور رہا ہے۔

اُردو ادب میں سینکڑوں داستانیں لکھی گئیں جس میں تحسین کی نو طرز مرصع، سرور کی فسانۂ عجائب، میرامن کی باغ و بہار۔ اور پھر داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا وغیرہ نے شہرت و دوام حاصل کیا۔ ان داستانوں نے قاری کے ذہن کیلئے طرح طرح کی دلچسپیاں و نیرنگیاں پیدا کیں۔ ان میں

زندگی کے حقیقی خدوخال نہیں ملتے بلکہ ایک پر اسرار اور تصوراتی زندگی ملتی ہے جہاں غموں کی دھوپ کی بجائے صرف خوشی کے سائے منڈلاتے ہیں جہاں "روح اُمم" کی حیات "کشمکش انقلاب" نہیں بلکہ جاہ و ثروت عیش و عشرت، ابدی سکون و راحت ہی زندگی ہے جن میں شمشیر و سنان کا پتہ نہیں صرف طاؤس و رباب کو اہمیت حاصل ہے۔ طلسماتی زندگی، محیرالعقول کارنامے "مافوق الفطرت افعال، کرشمہ سازیاں، پریوں کی باتیں، شیطانوں اور جنوں کے قصے، بدی پر نیکی کا دائمی غلبہ اور اسی طرح کی بے شمار باتوں سے ہماری داستانیں بھری پڑی ہیں۔ ان داستانوں نے یقیناً انسان کے دلی تقاضوں کی تکمیل کی ہے اور ان خوبیوں نے انھیں پرکشش بنا دیا۔ داستانوں کی بدولت زندگی اور فطرت کے تصادم سے پیدا شکست اور مایوسی کے اندھیروں میں بھی انسانی ذہن پر رومانیت اور تخیل کی چاندنی چٹکتی رہی۔

اردو ادب میں داستان سرائی کا دور شباب ابھی اپنی تابانیوں سے ذہن کو اس دنیا سے دوسرے جہانوں کی سیر کرا رہا تھا کہ کہانی کی ایک نئی صنف پیدا ہوئی جس میں انسان کو تصور و تخیل کی افیون نہیں دی گئی بلکہ اس زندگی کو جسے وہ برت رہا تھا۔ حقیقتوں سے روشناس کیا گیا صرف تفریح و دلچسپی کے علاوہ کہانی کو سماجی زندگی کے مقاصد کا آئینہ دار بنایا گیا۔ کہانی کی اس صنف کو ناول کہتے ہیں۔

ناول انگریزی لفظ ہے اسکی ابتدا مغرب ہی سے ہوئی۔ سروانٹیز کی ڈان کوئکزوٹ سے لیکر اسوقت تک کہ تمام ناولوں میں یورپی تہذیب کے میلانات اور اثرات ملتے ہیں۔ اٹھارویں صدی سے

یورپ میں ناول نے شاعری اور ڈرامے جیسی اہم ادبی اصناف کو پس پشت ڈالدیا اور ایک اہم ادبی فارم کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہر قسم کے سنجیدہ، فلسفیانہ، فکر انگیز اور سماجی و اصلاحی خیالات کے اظہار کیلئے اس صنف ادب کو ذریعہ اظہار بنایا گیا۔ ناول کے ذریعہ وعظ و نصیحت کے دفتر کھولے گئے، طنز کے تیر برسائے گئے۔ علمی مباحث، سیاسی مسائل اور مذہبی مسائل کو سلجھایا گیا لیکن ان سب باتوں کے باوجود ناول کا اصل مقصد تفریح و دلچسپی برقرار رکھنا ہے۔ اس مقصد کو عشق بتاں یا ر مانیکا کے ذریعہ یا پیر تصوف و اخلاق کی موشگافیوں سے حاصل کیا جا رہا ہے۔ ناول جمہوریت یا بورژوا دور کی دین ہے جب فرد اور سماج میں تصادم شروع ہوا اور جاگیردارانہ اقدار نے ذہنوں میں شکوک و اندیشے پیدا کئے اور سائنس نے روایات اور عقائد کی دھجیاں بکھیرنے کی کوشش کی اسوقت صنعتی انقلاب سے متاثر اس زندگی میں انسان اور اسکے مسائل کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تب ہی ناول کی تخلیق عمل میں آئی۔ ناول ایک پیچیدہ سماج کا مظہر ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکروں اور ناقدوں نے جدید سماج کی روح کو گرفت میں لانے کیلئے ناول کو تاریخ سے زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور کا خیال ہے کہ "ناول زندگی کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی، خواب بھی اور انکی تعبیر بھی ہے۔ مضمون نگار زندگی کے متعلق اظہار خیال کرتا ہے ڈرامہ زندگی کو شعلے کی لپک اور لہو کی دھار بنا کر پیش کرتا ہے۔ مگر ناول نگار زندگی کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے"

ناول کے بارے میں احتشام حسین کہتے ہیں کہ "ناول کی بناوٹ

ایک بڑی فیکٹری یا مشین کی بناوٹ سے شباہت رکھتی ہے اور اس میں زندگی معہ اپنے متعدد پہلوؤں کے حرکت کرتی ہوئی دکھائی جاسکتی ہے۔"

ناول میں پلاٹ وکردار کے ذریعہ زندگی کی عکاسی ہو جاتی ہے اور یہ ڈرامہ سے موثر ہے پھر یہ ڈرامہ کی طرح اسٹیج کی محتاج نہیں ہے اسلئے میرین کرافورڈ نے ناول کو "پاکٹ تھیٹر" کہا ہے۔

ناول کی اس حقیقت و ماہیت کو سمجھنے کے بعد ہم جہاں انگریزی ادب میں رچرڈسن اور فیلڈنگ کو ناول کا موجد کہتے ہیں وہاں اردو ادب میں نذیر احمد کی کہانیاں ناول کا اولین نمونہ ہیں اور انھیں اس صنف کے اولین بانیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی کہانیوں کو تخیل و تصور سے بچا کر حقیقت آفریں بنایا ہے۔ اور صرف تفریح طبع کی بجائے سماجی مسائل اور زندگی کی بے شمار گتھیوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ داستانوں کے تکلف و تصنع سے انحراف کرتے ہوئے سادگی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے پاس جو کردار ملتے ہیں وہ حقیقت سے زیادہ مثالی ہیں مبالغہ اور جذباتیت کو بھی قارئین کی دلچسپی کیلئے انہوں نے جگہ دی ہے۔ انکی کہانیوں میں حقیقت پسندی اور زندگی سے ہم آہنگی کے باوجود شعریت، تخیل و تصور کے عنصر ملتے ہیں لیکن ان فنی کمزوریوں کے باوجود نذیر احمد نے کہانی کو حقیقت نگاری اور استراہ فن کا انداز دیا ہے جو آنے والوں کیلئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ بعض نقاد نذیر احمد کی ان کہانیوں کو ناول تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں جن میں ڈاکٹر احسن فاروقی قابل ذکر ہیں انکا خیال ہے کہ

"مولانا نذیر احمد کو ناول نگار کہا جاتا ہے اصل میں نثری تمثیل نگاری

کا پس منظر بالکل ناول کی طرح کا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے یہ صنف ناول کا پیش خیمہ کہلائی جاتی ہے مگر اسکا فن ناول کے فن سے مختلف ہے اسلئے میں نذیر احمد کی کہانیوں کو ناول نہیں تمثیل سمجھتا ہوں" مگر پروفیسر احتشام حسین کے خیال میں اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد کو بعض نقاد ناول نگار نہیں مانتے لیکن یہ محض اصطلاح کا جھگڑا ہے ہیں انکی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھکر انھیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں"

احتشام حسین کے خیال کی تائید آل احمد سرور کے اس بیان سے ہوجاتی ہے کہ "ہمارے یہاں نذیر احمد کی کہانیوں کو ناول کا اولین نمونہ کہا جاسکتا ہے اور وقار عظیم نے "ناول کے اس فن کے دلکش سفر کی پہلی منزل" نذیر احمد کی ناولوں کو قرار دیا ہے۔

اس تنقید وتائید سے ہمارا تجزیہ یہی ہو سکتا ہے کہ نذیر احمد کے ناول میں وہ سارے "خط وخال" اور خوبیاں ملتی ہیں جن سے "ناول کے پیکر کی تخلیق وتعمیر ہوتی ہے"۔

نذیر احمد کے ناولوں کی حقیقت پسندی اور اہمیت تسلیم کرنے کیلئے ہمیں اس دور کے حالات کی نبض کو سمجھنا ہوگا جبکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے ہندوستانی عوام کی زندگی میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ان تبدیل شدہ حالات نے خاص طور پر مسلمانوں کی بندھی ٹکی خاندانی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ جاگیردارانہ عہد کی قدروں سے لوگوں میں شکوک اور اندیشے پیدا ہوگئے تھے انکے ناولوں میں شاہجہاں اور محمد شاہ رنگیلے کی دہلی اپنے معاشی زوال کی حالت میں ملتی ہے پرانے طور اور طریقے بیکار اور نئے انداز خطرناک دیکھائی دیتے تھے بقول احتشام حسین کے "اس دور کے

لوگوں میں نہ تو نئی تعلیم سے پوری ٹکر لینے کا حوصلہ تھا اور نہ اُسے نظر انداز کرنے کی ہمت تھی۔ نہ مذہب کو محض عقیدے کے قلعے میں بند رکھنے میں آسودگی تھی اور نہ اسکو عقل و سائنس کی کسوٹی پر کسنے کی جراءت پائی جاتی تھی۔ اسی عہد کی مکمل تصویر اور تفسیر نذیر احمد کے ناولوں میں نظر آتی ہے۔
نذیر احمد اپنے ناولوں میں اس سماجی ڈھانچہ میں مذہب، تعلیم، خاندانی عزت و وقار اور پرانے و نئے اقدار میں توازن و ہم آہنگی قائم کرنیکی صورتیں اصغری، نصوح، کلیم، ظاہر دار بیگ، ہریالی، مبتلا، مولانا عارف، حجۃ الاسلام اور ابن الوقت کے کرداروں میں پیش کرتے ہیں۔ ان سارے کرداروں میں اس عہد کی کشمکش جھلکتی ہے یہ کردار اپنے شعور و صلاحیت کے اعتبار سے سماجی انتشار اور ابتری کو مختلف ذرائع سے دور کرنے کی جد و جہد کی نمائندگی کرتے ہیں یہ چند کردار مختلف مسائل کے نمائندے بن کر متحرک صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ تخیل سے دور اور حقیقت سے قریب نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں میں دلی کے گلی کوچوں اور اسکی عمارتوں سے لیکر انیسویں صدی کا بدلتا ہوا پورا ماحول اپنی اصلی حالت میں بے نقاب ہو جاتا ہے۔

اگر نذیر احمد کی ناولوں میں صرف زبان کی لذت اور مقصدیت سے گریز ہوتا تو پھر انکے کارناموں پر اتنا غور کرنیکی ضرورت نہ ہوتی۔

نذیر احمد نے "مراۃ العروس" "بنات النعش" "توبۃ النصوح" "فسانہ مبتلا" "ایامیٰ" اور "ابن الوقت" جیسی اپنی مشہور ناولوں [illegible] اور فکر انگیز سماجی حقائق پیش کئے ہیں۔

"مراۃ العروس" اور پھر بنات النعش" میں انہوں نے خانگی زندگی

کو انتشار سے بچانے کیلئے گھر کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھنے کے مسئلہ
کو واضح کیا ہے۔ خانہ داری کے مسائل اور تعلیم نسواں جیسے اہم امور پہ
انہوں نے اصلاحی خیالات پیش کئے ہیں۔

توبۃ النصوح میں مذہبی موضوعات پہ نذیر احمد نے قلم اٹھایا ہے۔
فسانہ مبتلا میں مسلمانوں میں ایک سے زائد شادی سے پیدا ہونے والی سنگین
صورتحال اور گھریلو زندگی میں انتشار کی کیفیات کا جائزہ لیا ہے۔

"ایامیٰ" میں انہوں نے عقد بیوگان کے مسئلہ کو اٹھایا اسوقت ہندو
تہذیب کے اثر سے مسلمانوں میں بیوہ سے عقد کرنے کو عیب تصور کیا
جاتا تھا اس بات کو مولانا نے اپنی ناول میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

"رویائے صادقہ" میں انہوں نے مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کو
دور کرنے اور انھیں اجتہادی مسلمان بننے کی تلقین کی ہے۔ اسطرح نذیر احمد
کی ناولیں اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود ایک گہرا سماجی شعور رکھتی ہیں۔
انہوں نے اپنی ناول "ابن الوقت" میں جدید تہذیب کو اختیار کرنے یا رد
کرنے کی کشمکش کو ظاہر کیا ہے۔ انیسویں صدی کا آخری دور ایک عجیب کشمکش
سے دوچار تھا۔

نذیر احمد نے اس ناول میں ایسے کردار پیش کئے جو اپنے لئے راہیں
متعین کرنے میں کشمکش کا شکار تھے۔ پھر اس دور کے سارے مسائل کو
واقعیت کے انداز میں قصوں کی صورت میں پیش کرنا ایک بڑے فنکار
کا کام ہے جس طرح سرشار نے دانیٹیز اور شرر نے اسکاٹ کا ناول
ٹیلسمن پڑھکر اپنے لئے راہیں متعین کیں، نذیر احمد کے ہاں ایسا کوئی
اثر نہیں ملتا لیکن آنکے باوجود آنکے ناولوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس

صنف ادب کی اہمیت کو جانتے تھے اور اسکی مدد سے وہ حقائق کو پیش کر رہے تھے۔

نذیر احمد کے زمانہ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اودھ پنچ تحریک سے متاثر ہو کر تفریحی قصے لکھنے شروع کئے۔ سرشار کے "فسانہ آزاد" نے انہیں شہرت و کامیابی عطا کی اگرچہ کہ فسانہ آزاد بھی ناول کی پوری ترجمانی نہیں کرتا لیکن اسمیں ماحول کی لازوال تصویریں ضرور نظر آتی ہیں۔ سرشار نے بھی اپنے زمانے کے اس زوال پذیر سماج کو بے نقاب کیا ہے۔ جو حسن و عشق کے دیوانے ہیں۔

سرشار کے اہم ناولوں میں "فسانہ آزاد" جام سرشار، سیر کہسار اور پی کہاں ہیں یہ ناول، ناول نگاری کی فنی خصوصیات اور معیار سے پورے مطابقت نہیں رکھتے لیکن پھر بھی یہ زندگی کے روشن عکس ہونے کے باعث بلند حیثیت رکھتے ہیں بعض نقادوں کا خیال ہے کہ سرشار پر رجب علی بیگ سرور کا اثر غالب ہے جو انکی زبان دانی سے ظاہر ہے سرشار ہر فرد کی بولی کے طبقاتی اور انفرادی عناصر کو محصور کر کے اسکی فطرت کو مکمل طور پر ظاہر کرتے ہیں۔

سرشار کی ناول نگاری اپنے دامن میں بھدا پن اور خامیاں لئے ہوئے ہے مگر انکی فطرت کا رجحان اور اپنے کرداروں کو زندہ رکھنے کی صلاحیت انکے ناولوں میں موجود ہے اسلئے وہ اپنی کمزوریوں کے باوجود بھی ناول نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ سرشار کی ناولیں "فسانہ آزاد" "سیر کہسار" اور "جام سرشار" میں پہلی دو ناولیں انکے فن کو بلند کرتی ہیں اور تیسری ناول دوسری سے ملتی جلتی ہے۔ انکی ان ناولوں میں تسلسل، اور پلاٹ بکھرے

نظر آتے ہیں اسلئے یہ کہیں صرف فسانے ہی نظر آتے ہیں احسن فاروقی کے خیالات سے اس بیان کی یوں تصدیق ہوتی ہے کہ "سرشار معلوم ہوتا ہے افسانے اور ناول کے درمیان کی دیوار پہ ہاتھ ٹیکے کھڑے ہیں اور کودنے کا قصد کر رہے ہیں مگر آنکے پاؤں افسانے میں ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ وہ دیوار پار نہیں کر سکتے"۔ سرشار نے لکھنوی معاشرت اور تہذیب کی عکاسی ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے فسانہ آزاد میں واقعیت، مزاح اور زندگی کے تصور کو جس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ انکا بلند پایہ کارنامہ ہے انہوں نے خوجی کے کردار کو کردار نگاری کی بہترین مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور آزاد کے ذریعہ نئے انداز کو ہندستان کی معاشرتی زندگی میں قبول کیا ہے اس کردار میں انہوں نے زندگی کا رجائی اور پُر امید تصور پیش کیا ہے۔

سرشار کی قوت مکالمہ نگاری خوب ہے انہوں نے افراد کو زیادہ اہمیت دی انکے قوت تخیل کو بھی سراہے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ بلکہ شیکسپیر فیلڈنگ اور ڈکنس کی طرح تمام کائنات کو وہ اپنے تخیل میں سمانے کی قدرت رکھتے ہیں اُنکا ہر کردار محرک اور زندگی سے سرشار ہے۔

سرشار کے ہاں ایک غیر مذہبی اور سیکولر نقطۂ نظر ملتا ہے وہ اپنی ناولوں میں محرم و چہلم کا ذکر بھی کرتے ہیں تو مذہبی رسوم کے انداز میں کرتے ہیں۔

اُردو ناول کی تاریخ میں سرشار کا فسانۂ آزاد ہمیشہ نمایاں حیثیت کا حامل رہیگا۔ کیونکہ اس میں لکھنؤ کے ایک خاص عہد کو زندہ رکھا گیا ہے سرشار نے اس شہر کی ہر پوشیدہ چیز کو عیاں کیا ہے جلوتوں و خلوتوں

کے راز فاش کئے ہیں لکھنؤ کی سماجی، معاشی غرض زندگی کے ہر پہلو کا گویا انہوں نے ایکسرے کیا ہے اسطرح سرشار نے "ناول کو زندگی کی وسعتوں کا حامل" بنا دیا ہے۔ بقول احسن فاروقی

"سرشار کے ناول اردو ناول کی ارتقاء میں نقش اولیں سے بہت آگے ہیں۔ اور اردو میں وہ ناول کے موجد کہلائے جاتے ہیں"

نذیر احمد اور سرشار کے بعد مولانا عبدالحلیم شرر ہیں جنہوں نے اردو ناول نگاری میں ایک نئی روشن اختیار کی انھیں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا ترجمان اور مبلغ بھی کہا جاتا ہے۔ سرشار، سرسید احمد خاں، نذیر احمد، چراغ علی اور شبلی کے خیالات سے متاثر تھے انہوں نے اپنے زیادہ تر ناولوں میں مسلمانوں کی قدیم تاریخ کو واضح اور روشن کیا ہے شرر مسلمانوں کو انکی ماضی کی پر عظمت دیرینہ داستانیں سنا کر انکے دلوں میں تعین اعتماد اور جذبہ عمل کی حرارت پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمان حالات کا ہمت و جرأت سے مقابلہ کریں۔ شرر نے نذیر احمد کی طرح فوری مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں مدد نہیں دی بلکہ وہ قوم کے جذبۂ افتخار اور احساس برتری کو ضرور ابھارنا چاہتے تھے۔ شرر کو اردو کا والٹر اسکاٹ کہا جاتا ہے انہوں نے اپنے بے شمار تاریخی ناولوں میں پلاٹ کے ارتقاء کے مقابلہ میں حسن ترتیب اور چستی کو اہمیت دی شرر سرشار سے آگے ہیں۔ انکے ہاں قاری کی دلچسپی کیلئے داستان کا ڈھانچہ ضروری ہے۔ وہ کردار نگاری کے زیادہ موید نہیں ہیں۔

شرر نے نذیر احمد کی طرح اپنی ناولوں میں تبلیغی مقصد اور جزئیات کو برابر پیش نظر رکھا ہے وہ اصلاحی مقصد کو پیش کرتے ہوئے بھی ناول

کے فنی مطالبات سے گریز کرنے کی بڑی کامیاب حد تک کوشش کرتے ہیں انہوں نے فن ناول نگاری کی مبادیات کو اپنی ناولوں میں اہمیت دی ہے۔ شرر نے ناول کے فنی تقاضوں کو پورے شعور کے ساتھ برتنا شروع کیا۔

شرر کی بہترین ناولوں میں فردوس بریں، منصور موہنا، ملک العزیز ورجنا ہیں۔ انکے سارے ناولوں کے کردار معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ملتے جلتے نظر آتے ہیں اور ۔۔۔۔۔ ان میں واقعات کے ساتھ کردار نشو و نما نہیں پاتے۔

ڈاکٹر زور نے کہا ہے کہ "شرر کے ناولوں میں بہت کم ایسے پارے منتخب کیے جاسکتے ہیں جو انکے مضامین کے بعض پاروں کی طرح خاصہ کی چیز یعنی ادب العالیہ کہلائے جاسکیں"۔

شرر کے ناول کی سطح کئی حیثیتوں سے نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں کی سطح سے پست تھی لیکن کچھ تو انکا انداز بیان اور کچھ موضوع دونوں نے انھیں ہردلعزیز بنایا انہوں نے جو چند اصلاحی ناول لکھے ہیں انکے موضوعات وقت کے عام تقاضوں اور اصلاحی انداز فکر سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان میں زیادہ قوت تاثیر نہیں ہے اردو ناول نگاری میں نذیر احمد، سرشار اور شرر کو اولین پیش رو قرار دیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں بہت سے ناول نگار افق پر ابھرنے لگے لیکن اسلامی تاریخی ناولوں کو عام شہرت حاصل ہوئی شرر کے مقابلہ میں محمد علی طبیب تھے ویسے شرر طبیب سے زیادہ تاریخی شعور رکھتے تھے اور وہ ایک اچھے مورخ بھی تھے۔ شرر کا مقصد بھی اپنے تاریخی شعور سے ہم آہنگ تھا اسلئے شرر کے ملک العزیز ورجنا، منصور، موہنا، فتح اندلس کے مقابلہ میں طبیب کے جعفر عباسیہ، خضر خاں، دیول دیوی،

وغیرہ کو ادبی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

شررؔ کے ساتھ اودھ پنچ اسکول کے ناول بھی قابل ذکر ہیں سجاد حسین نواب اور جوالا پرشاد برق کے تراجم اردو ناول کی تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں۔ سجاد حسین اور علامہ راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں ایک خاص روش سے متاثر ہو کر بھی اپنا مخصوص رنگ پیدا کیا ہے۔

سجاد حسین کے ناولوں میں بھی فسانہ آزاد کی نمایاں تقلید کی پوری جھلک ملتی ہے۔ حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی میں انہوں نے ایک خاص معاشرہ اور اسکے امتیازی کرداروں سے مل کر ایک حقیقت پسند زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے جس میں مصنف کی فکر اور اسکے احساس کا عکس ضرور ہے کرداروں کے مکالمے واضح ہیں۔ زبان و بیان پر مہارت، تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے حقیقت کو انتخاب کر کے پیش کرنا سجاد حسین کے ناولوں کی خوبیاں ہیں

علامہ راشد الخیری نے اپنی ناول نگاری کو نذیر احمد کے خطوط پر چلانے کی کوشش کی آنکے ہاں مراۃ العروس اور بنات النعش کی طرح عورتوں کی اصلاح کی طرف توجہ دیگئی لیکن یہ نذیر احمد سے کچھ آگے نکلتے ہوئے عورت کی سماجی حیثیت کو بلند کرنے کی موثر نمائندگی اور حمایت کرتے ہیں۔ پروفیسر سرورؔ کے الفاظ میں " راشد الخیری کے ناول عورت کی مظلومیت کی داستان ہیں۔ اُنکے ہاں اصلاحی جذبے تبلیغی خدمات، خطابت، جذباتیت اور اُنکی اُکتا دینے والی یکسانیت راشد الخیری کو اس میدان میں کوئی بڑا درجہ نہیں دیگی میرے نزدیک وہ انشا پرداز تھے ناولسٹ نہ تھے "

راشد الخیری نے عورت کی معاشرتی زندگی کے اُن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن پر کوئی خاص توجہ نہ کی گئی تھی۔ وہ عورت کی زندگی کو عورت کی

نظر سے دیکھتے ہیں اور اسکے دکھ درد کا مداوا تلاش کرنے کیلئے کوشاں رہتے ہیں، اسطرح انہوں نے معاشرہ کے اس اہم طبقہ کی روداد، اُنکے مسائل اُنکی خوابیدہ صلاحیتوں کی نشاندہی کرنے اور انھیں ترقی کرنے اور بلند حیثیت دینے کی ترجمانی کی ہے اس لحاظ سے وہ کامیاب ناول نگار سمجھے جاسکتے ہیں۔ اس بیان کی تائید وقار عظیم کے اس نقطہ نظر سے ہوتی ہے کہ "کوئی ناول نگار جب تک کسی خاص فرد، جماعت یا معاشرے اور اسکے مسائل کے ساتھ صحیح ہمدردانہ تعلق نہ پیدا کرے اور اسکے غموں کو اپنے دل کا ناسور نہ بنائے وہ اس تجزیاتی مشاہدے کی طرف مائل نہیں ہوتے جس سے اچھے ناول کا واقعاتی پس منظر بنتا ہے"

بیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے اردو ناول نگاری کے اُفق پر ایک اور روشن ادبی ستارہ نمودار ہوا یہ ہیں مرزا ہادی رسوا، جنھوں نے اپنی ناول امراؤ جان ادا لکھی اور ناول نگاری میں حقیقت نگاری اور فن کاری کا زبردست امتزاج پیدا کیا رسوا نے ادب میں عورت کے سماجی مقام کا تعین کیا۔ اپنی ناول میں رسوا نے لکھنو کے معاشرۂ تہذیب و تمدن کا خوبصورت اور دلچسپ خاکہ نہایت فطری انداز میں کھینچا ہے انہوں نے اودھ کی زوال پذیر نوابی زندگی کے دھندلے نقوش اُبھارے ہیں۔

رسوا کے ناول ذات شریف اور شریف زادہ ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں جو معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہو گئے تھے اور جن سے بعض قومی اور اصلاحی تحریکات پیدا ہوئی تھیں اسکے اثرات ملتے ہیں خاص طور پر شریف زادہ میں اس نئے انسان کی جدوجہد کی تصویر پائی جاتی ہے جو نئے سماج میں اپنا مقام اور اپنی حیثیت کا تعین کرتا ہے رسوا سے قبل

اردو ناول نگاری میں ایسی ناولوں کی مثال نہیں ملتی۔

رسوا کی ناولوں سے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ انہوں نے حقیقت نگاری کو اپنایا اور روزمرہ زندگی سے کردار اور پلاٹ لیکر پورے سماج کی عکاسی کی ہے جس میں مبالغہ، اور رعینیت کی آمیزشش نہیں بلکہ صاف، واضح اور رواں طرز تحریر ہے۔

اپنی ناولوں کے بارے میں خود رسوا کہتے ہیں کہ "ہمارے ناول نہ ٹریجدی ہیں نہ کامیڈی، نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہو نہ ہجر ہوا ہو نہ وصال بلکہ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہئے"

رسوا کی امراؤ جان ادا ایک دلچسپ قصہ ہے جسکی زبان دہلی، منجھی اور سلجھی ہوئی ہے اور اسکا انداز بیان نہایت دل نشین ہے۔

رسوا کے شاہکار امراؤ جان میں زندگی کے سیدھے سادھے بظاہر معمولی اور غیر اہم مشاہدات کے پس پردہ تہذیب و تمدن، معاشرت اور سیاست و اخلاق اور بعض اوقات تاریخ کے حقائق پائے جاتے ہیں۔ وہ معلم اخلاق ہونے کے علاوہ ایک خوبصورت فن کار ہیں۔ جن کے پاس فنی نظم و ضبط کے ساتھ تنوع اور دلچسپی پائی جاتی ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایک اور ناول نگار مرزا محمد سعید تھے جنہوں نے اپنا ناول "خواب ہستی" لکھا ہے۔

"امراؤ جان ادا" اور "خواب ہستی" دونوں اپنے فنی اعتبارات سے مختلف ہیں لیکن دونوں میں موضوع مشترک ہے مشاہدہ، فکر اور احساس کی ہم آہنگی نے انکے فن میں جادو، جاذبیت ، موضوع میں دلکشی اور

انداز بیان میں حسن و جمال کی کیفیت پیدا کردی ہے۔

ناول نگار کو مشاہدہ، فکر اور احساس ہی زندگی کی وسعتوں سے ہم آہنگ کرتا ہے اور اسکی تخلیق دلوں میں پیوست، ذہن پر نقش اور احساس پر چھا جاتی ہے۔ فن ناول نگاری کی ان مضبوط و مستحکم بنیادوں پر منشی پریم چند نے ناول نگاری کی پرشکوہ عمارت کھڑا کی اور اپنے خون جگر سے اسکی زیبائش و آرائش میں سرگرم حصہ لیا۔

پریم چند اس دور کے ترجمان ہیں جبکہ مغربی اثرات کے باعث ذہنی آزادی اور خیال آرائی نے کچھ لوگوں کو سماجی پابندیوں سے بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ پرانی قدروں سے نفرت اور تخیل کے سہارے نئی راہوں پر چل نکلنے کا جنوں سوار تھا اور چند لوگ حقیقت میں زندگی کے مسائل کا مادی حیثیت سے حل چاہتے تھے۔ ان تقاضوں کی تکمیل اور انکے اظہار کیلئے ناول کا سانچہ بہت موزوں و مناسب تھا ان ہی مادی حقائق کی عکاسی پریم چند نے اپنے ناولوں میں کی ہے ابتداء میں انہوں نے محض رسمی ناول لکھے جس میں اصلاحی امور پر توجہ دیگئی لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے گرد و پیش کے مسائل اور حالات کو ناول میں پیش کیا اپنی مخصوص تصور پرستی کے باوجود حقیقت کو اپنے ناولوں میں بنیادی جگہہ دی۔

پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ ہیں کہ " پریم چند نے پہلی دفعہ معمولی میں غیر معمولی اور خاموشی میں اضطراب کی جستجو کی "

پریم چند نے ہر انسان کو سمجھا، اسکے دل کی دھڑکن بن کر اسے ٹٹولا اور اسکی آرزؤں اور خواہشات کا آباد جہاں دیکھا اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے ان جذبات و خواہشات کے محرکات محسوس کئے۔ انسان کو

سمجھنے اور پھر دوسروں کو سمجھانے کی فنکارانہ صلاحیت ایک بلند پایہ فنکار کا کام ہے۔ جو پریم چند میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

پریم چند کی ناولوں کے کردار ہندوستان کے عام انسان ہیں اور یہ کردار زندگی کے حقیقی نمونے ہیں ان کرداروں کی کش مکش، الجھنیں زندگی کے حقائق کی ترجمان ہیں پریم چند کی ناولیں بازارِ حسن، گوشۂ عافیت میدانِ عمل اور گئودان فن کی عظمت و بلندی کے شہ پارے ہیں ان ناولوں نے فنِ ناول نگاری میں انقلاب پیدا کیا ہے۔

پریم چند کی ناولوں میں اصلاحی مقاصد کے سائے ہیں لیکن اس مقصد پسندی کے باوجود انہوں نے فن کے حسن اور اسکی عظمت کو برقرار رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں معا... سیاست اور معیشت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ بھی کیا ہے۔ جس سے ایک ... عہد کی مکمل تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے اسطرح ایک قوم کے مزاج ... مفسر بھی ہیں اور مبصر بھی۔

پریم چند کے ناول ہندوستان کی متوسط نچلے اور دیہاتی طبقات کی زندگی کے آئینے ہیں اس سے انکی انسانیت دوستی اور احساس محبت کی شدت ظاہر ہوتی ہے انکے ناولوں میں واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے باوجود ایک گہرا نفسیاتی احساس چھایا رہتا ہے جو بظاہر سادہ لیکن اس سادگی میں زندگی کی وسعتیں اور گہرائیاں پنہاں ہیں۔ پریم چند کے بعد اردو ناول نگاری کا کاروا سبک رفتار کے ساتھ ہی سہی لیکن رواں دواں ہے جب تک انسان اور اسکی زندگی کی وسعتیں پھیلتی جائینگی ہمارے ناول بھی اپنے فنی احساس اور فکری انہاک کو لیے ہوئے اس زندگی سے ہم آہنگ ہو کر انسان کے دوش بدوش رہینگے کیونکہ پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں "ناول اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے"۔

ادب اور صحافت

ادب اور صحافت کے درمیان ہم نہ کوئی واضح خط کھینچ سکتے ہیں اور اور نہ ہی ایک کو دوسرے سے مربوط کرتے ہوئے اُن کی جُداگانہ حیثیت، مقاصد اور اہمیت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ادب اور صحافت کا سلسلۂ نسب تاریخ و روایتی اعتبار سے یکساں ہے۔ دونوں زبان کے پروردہ ہیں لیکن اُن میں بنیادی فرق بھی پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات کوئی تحریر ادبی رنگ و آہنگ سے معمور ہونے کے باوجود صحافت کے زمرے میں شمار کی جاتی ہے اور کبھی کوئی صحافتی تحریر ادب کے حدود میں شامل قرار دی جاتی ہے۔ مغربی ادب میں اور خود اردو میں ایسی کئی ادبی نگارشات موجود ہیں جن کو ہم نے صحافت کا درجہ دیا ہے اسی طرح اخبارات و رسائل کے مضامین جب کسی کتاب کی شکل میں منظر عام پر آتے ہیں تو اُن کی ادبی حیثیت ہو جاتی ہے۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ ادب اور صحافت میں بعض امور میں اختلاف کے باوجود ایک تعلق اور لگاؤ کی سی کیفیت موجود ہے۔ اکثر ادبی تحریروں نے اپنے وقتی اور عارضی اثر کے باعث صحافت کا رول انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والے مضامین وقتی موضوع پر ہونے کے باوجود ادب عالیہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔

برنارڈ شا نے کہا ہے "پورا ادب عالیہ صحافت میں شامل ہے"

'ALL GREAT LITERATURE IS JOURNALISM'

مغرب میں ادب اور صحافت نہ صرف دوش بدوش ہیں بلکہ زندگی کی ہماہمی میں دونوں کا رول لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا ہے۔ برطانیہ میں اکثر

ادیبوں کے لیے صحافت کی تیکنک سے واقفیت ناگزیر ہے لیکن امریکہ میں صورتِ حال کسی قدر مختلف رہی ہے چنانچہ سائمن اسٹرنسکی نے کہا تھا کہ امریکی ادب کے لیے یہ بات نامناسب ہے کہ وہ موجودہ صحافت کے مزاج سے ناواقف رہے۔ اس نے تجویز رکھی کہ امریکی ادیبوں اور مصنفین کو کسی ماہر ایڈیٹر کی نگرانی میں تربیت دی جائے تاکہ ان کی تحریر میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو۔ اسٹرنسکی نے دراصل ایسی تحریر کی شدید مخالفت کی ہے جس میں صرف زبان ہی زبان ہو اور قاری خیال تک جلد رسائی نہ حاصل کرسکے۔

یہ حقیقت ہے کہ اکثر ادیبوں نے اخبارات و رسائل کے لیے مضامین لکھنے شروع کیے اور بعد میں اُن کی تحریروں کو ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔ برطانیہ میں ایسے بے شمار صحیفہ نگار ادیب ملیں گے جنھوں نے دونوں حیثیتوں سے شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ ان میں ڈانیل ڈیفو جوزف ایڈیسن، رچرڈ اسٹیل، جوناتھن سانیٹ، لیمب، چارلس ڈکنس، ولیم میک پیس روڈیارڈ کپلنگ، یم بیری، جی کے چسٹرٹن، برنارڈ شا، یچ جی۔ ویلز اور ربیکا ویسٹ شامل ہیں۔

امریکی ادب میں بھی ایسے ممتاز ادیب ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں میں ادب و صحافت کو بڑی فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے ان میں الکزینڈر ہملٹن سے ولیم کولن برائیٹ، مارک ٹوین یوگن فیلڈ تک اور جدید ادیبوں میں ارنسٹ ہمنگ وے اور جان اسٹین بیک شامل ہیں۔ ان کی تخلیقات ادبی اور صحافتی نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہیں۔ اُردو میں ایسے کئی اخبارات ہیں جنھوں نے نہ صرف اس دور کی ترجمانی کی ہے بلکہ ادب کی بھی قابلِ لحاظ خدمت کی ہے۔ ان اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین نے ہر موڑ پر شعر و ادب کی رہنمائی کی اور اُردو زبان و ادب میں نئے رجحانات پیدا کیے۔ 'اودھ پنچ'، 'تہذیب اخلاق'، 'زمیندار'، 'نگار'، 'الہلال و البلاغ'

'پیام' اور اسی طرح کے متعدد اخبارات و رسائل نے صحافتی و ادبی دونوں حیثیتوں سے زبان و ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ ایسے بے شمار صحافی ہیں جنھوں نے اُردو ادب میں نئی نئی اصطلاحات وضع کیں اور الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ کیا ۔ سرسید نے اسٹیل اور اڈیسن کے جرائد اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر سے متاثر ہوکر اُردو میں تہذیب الاخلاق کے ذریعہ ایک ایسے ادب کا آغاز کیا جو صحافتی انداز لیے ہوئے تھا ۔ زبان کی سادگی بیان کی بے تکلفی و برجستگی اور مواد کی زیادہ سے زیادہ فراہمی ' سرسید کی تحریروں کا خاصہ تھی ۔ اس کے بعد ہی اُردو ادب میں ایک نئے اسلوب کی داغ بیل پڑی ۔

اُردو کے بے شمار اخبارات و رسائل نے آزادی کی جدوجہد میں نہ صرف صحافت بلکہ ادب کو بھی نئے مزاج سے روشناس کیا ہے ۔ ادب اپنے عہد کا ترجمان رہا ہے ۔ ہر بہتر ادبی تخلیق میں اس دور کی تہذیب تمدن اور رجحانات کی بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ ادب اور صحافت کے اس تعلق کو محسوس کرنے کے بعد ہمیں ان میں جو جداگانہ خصوصیات ملتی ہیں ان کا جائزہ لینا ہوگا ۔ صحافت اور ادب میں بنیادی فرق ، ادیب یا صحافی کے مقصد و نصب العین سے وابستہ ہے ادب کو ہم ذاتی خیالات افکار اور تجربات کا نچوڑ قرار دیتے ہیں ۔ جب کہ صحافی اپنی کمیونٹی یا طبقے کے خیالات و تجربات کی ترجمانی کرتا ہے ۔ ادب کم حقیقت پسند ، تخیلی اور آئیڈیل ہوتا ہے جبکہ صحافت میں حقیقت پسندی اور واقعات کی صحیح صحیح تعبیر و تشریح کی جاتی ہے ۔ صحافت کو ایک تیز رو ادب 'LITERATURE IN HURRY' سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ صحافت میں وقت اور موقعہ TIME LINESS کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ جبکہ ادب ' وقت زمانہ اور زمان و مکاں سے ماورا ہوتا ہے ۔

صحافتی تحریر مختصر جامع اور واقعات کو جوں کا توں بیان کرنے والی ہوتی ہے۔ صحافت میں کسی بھی واقعہ کا کلائمکس ابتداء میں ہوتا ہے۔ جبکہ ادبی تحریر میں اس کی نوعیت بالکل متضاد ہوتی ہے۔ ادبی تحریر میں دھیما پن در مبہم خیالات پیش کیے جاتے ہیں پھر جذبات و احساسات کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی آزادی رہتی ہے۔ ادب لافانی اور لازوال ہوتا ہے۔ اخبارات اور رسائل کی عمر نہایت محدود ہوتی ہے بقول ایک ممتاز صحافی 'NOTHING IS DEAD AS YESTERDAY'S PAPER' "گزشتہ کل کے اخبار کی طرح شاید ہی کوئی تحریر ناکارہ ہو"۔ ادب میں اسلوب جذبات اور تصورات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ جبکہ صحافت کا زیادہ تر تعلق اس کے مواد اور متن سے ہوتا ہے۔ ادب میں ہیئت (FORM) کو ترجیحی اہمیت حاصل ہے، صحافت کا آغاز کلائمکس سے ہوتا ہے لیکن ادب میں کلائمکس رفتہ رفتہ اختتامی مراحل پر رونما ہوتا ہے۔ صحافت میں موضوعات کے اعتبار سے متن کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ لیکن ادب میں ایک موضوع کے تحت بے شمار مضامین کا احاطہ کیا جا سکتا ہے ہمارے ملک میں ایسے کئی صحافی ہیں جنھوں نے صحافت کے علاوہ ادب میں نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں اُن میں اب بھی خواجہ احمد عباس، جی۔ کے۔ ریڈی، نین تارا سہگل، خشونت سنگھ، نرجس زلال، قرۃ العین حیدر، ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر شام لال ہیں۔ ان کے علاوہ اُردو اخبارات میں ایسے بے شمار صحافی ہیں جن کے مضامین اداریئے، فیچرس میں ادبی شان نمایاں ہے۔ خاص طور پر اُردو کے بلند پایہ اخبارات و جرائد ہماری زبان، سیاست، رہنمائے دکن، قومی آواز وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں صحافتی انداز کے باوجود بے شمار ادبی خصوصیات

موجود ہیں۔ ان میں شایع ہونے والے بہت سارے مضامین کو بہترین ادبی تخلیقات میں شمار کیا جاسکتا ہے خاص طور پر ہماری زبان میں ممتاز نقاد و ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے جو صحافتی مضامین لکھے ہیں وہ ادبی حیثیت سے بلند مرتبہ کے حامل ہیں ان مضامین پر مشتمل ان کی کتاب 'اردو کا المیہ' صحافتی اور ادبی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔

ادب اور صحافت کے فرق کو محسوس کرتے ہوئے یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ ادیب کے پیش نظر مخصوص قاری نہیں ہوتے جبکہ صحافی کو پڑھنے والا ایک مخصوص حلقہ ہوتا ہے جن کی علمی سطح ' قابیت اور جذب کرنے کی صلاحیت سے وہ عام طور پر واقف رہتا ہے کوئی اعلیٰ درجہ کا اخبار یا رسالہ جو اپنی طباعت اور مواد کے اعتبار سے نہایت معیاری ہو اور اس کی قیمت بھی زیادہ رکھی گئی ہے یقیناً سماج کے اونچے متمول اور زیادہ پڑھے لکھے طبقہ میں پڑھا جائیگا۔ اس لیے اس میں جو اداریئے ' مضامین اور فیچرس شایع ہونگے۔ ان کا معیار ان کی نوعیت بھی اسی انداز کی ہوگی مثال کے طور پر امریکی جریدہ 'ٹائم' میں اگر کوئی کسی منجن کا اشتہار دے اور کسی ضلع سے شایع ہونے والے اخبار میں کوئی فضائی کمپنی کا اشتہار شایع ہو تو یہ دونوں طبقوں میں پڑھنے والوں کے لیے غیر سودمند ہوگا یہی حال مضامین اور اداریوں کا بھی ہے اوسط درجہ یا پھر کم درجہ کے اخبارات و جرائد کو اپنے قارئین کے کے ذوق کے مطابق معلومات اور افکار پیش کرنے ہوتے ہیں گویا صحافی کے نزدیک ایک مخصوص طبقہ پیش نظر ہوتا ہے لیکن ادب میں صورتحال مختلف رہتی ہے۔ ادیب کے آگے ایک مخصوص طبقہ نہیں ہے بلکہ مختلف علمی سطح اور معیار رکھنے والے قاری ہوتے ہیں اس لیے ادیب کو ترسیل و ابلاغ کے لیے تعمیم ' کا انداز اختیار کرنا ہوتا ہے۔

صحافت ادب ہی کی ایک قسم ہے جس میں واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ جبکہ ادب ان واقعات کی تشریح اور ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ وائیکم اسٹیڈ نے

کہا ہے کہ صحافی کو قدیم فلسفہ، عصر حاضر کی تاریخ اور سائینسی علوم میں بہترین معلومات ہونی چاہیئے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اسی طرح جس طرح "ایک سچا دین دار اپنی دینداری کو چھپاتا ہے وہ اس علم کو ضرورت کے وقت لاکھوں آدمیوں کے سامنے اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ ان کے ذہن و دماغ کا جُزو بن جائیں۔"

صحافتی مضامین حالات اور واقعات کے اظہار کا نام ہی نہیں بلکہ وہ ان افکار و خیالات کا بھی اظہار کرتے ہیں جنھوں نے ان واقعات کو جنم دیا ہے۔ صحافت حقایق سے راست طور پر آگاہی کا نام ہے۔ صحافتی مضامین کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سچائی، صداقت، صاف گوئی، آسان زبان و بیان الفاظ کے کم استعمال اور غیر مبہم خیالات پر مبنی ہوں۔ ایسی تحریریں جو خیال کو واضح نہ کرسکیں صحافت میں شامل نہیں ہیں۔ تحریر میں چستی روانی اور بے ساختگی مواد کی کثرت بہترین صحافت کے معیار ہیں۔ ادب میں بھی جو نئے رجحانات پیدا ہوئے ہیں وہ اسی اندازِ فکر کی پیروی کر رہے ہیں لیکن اگر قدیم ادبی شہ پارے جو مسجع و مقفیٰ عبارتوں سے مزین، زبان و بیان کی کثرت اور حقیقت پسندی سے زیادہ ماورائیت اور تخیل پسندی سے معمور ہیں تو ہم انھیں ادب سے خارج بھی نہیں کرسکتے کیونکہ ادب کے مقاصد بعض ادوار میں جدا رہے ہیں ادب کو صرف تفریح کا ذریعہ قرار دیا جاتا رہا اور اس تفریح کے مقصد کی تکمیل کے لیے حقیقت سے دور کتنے ہی خیالی اور تصوراتی جہاں آباد کرلیے گئے۔ ایسا ادب انسانوں کے لیے دلچسپی اور مسرت کا باعث رہا لیکن پھر جیسے جیسے سماجی اندازِ فکر میں تبدیلی آئی ادب کے سانچے بھی بدلتے گئے۔ ادب اب زندگی کا ترجمان بن گیا ہے اور زندگی واقعات کے گرد و پیش سے اپنا واسطہ نہیں توڑ سکتی اس اعتبار سے ہم صحافت کی اہمیت کو بھی گھٹا نہیں سکتے۔ بلکہ میرے خیال میں ادیب صحافت کے ذریعہ

زندگی کے بے شمار تجربوں سے آشنا ہوتا ہے اور یہ تجربے اور واقعات اس کی فکر کو جلا دیتے ہیں اسی طرح ہر صحافی ادیب کی زبان و ادب سے ہی استفادہ نہیں کرتا بلکہ وہ ادیب کے انداز فکر سے تاثر قبول کرتے ہوئے کسی بھی واقعہ کے پس منظر میں ایک نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی صلاحیت اور طاقت محسوس کرتا ہے۔ اس بحث سے یہی معلوم ہوا کہ ادب اور صحافت زندگی کا لازمہ ہیں دونوں کے درمیان فاصلے زیادہ سمٹے ہوئے ہیں اور ان میں خلیج دشوار ہے۔

ادب کا مقصد زندگی کی تہذیب و تعمیر ہے ادب نے ہمیشہ انسان کو ذہنی و روحانی مسرت اور تفریح کے سامان ہی فراہم نہیں کیے بلکہ زندگی کو برتنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ ادبی تاریخ شاہد ہے کہ ادب سے ہر دور میں مختلف انداز سے کام لیے گئے ہیں۔ فرانس میں روسو کی ادبی تحریریں انقلاب فرانس کا محرک رہیں اسی طرح ہندوستان کی آزادی میں الہلال والبلاغ اور دیگر بے شمار تحریریں انگریزوں کے خلاف ایک بھرپور وار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سر سید نے ادب سے سماجی و مذہبی اصلاح کے کام لیے ادب کو تبلیغ کا ذریعہ بنایا گیا۔ سیاسی نظریات کی تشہیر کے لیے ادب ہی کو واسطہ کی حیثیت حاصل رہی غرض ادب زندگی کا آئینہ دار بن کر ہر دور میں اپنے مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا اس لحاظ سے ادب کے مقاصد کو محدود کرنا یا ان کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے مذکورہ بالا امور میں ہمارا ادب کہیں کہیں صحافتی رنگ۔ اختیار کرتا نظر آتا ہے اور بعض مرحلوں پر ادب سے صحافت کے مقاصد کی تکمیل کرائی گئی ہے۔ ادب نے ذہن و فکر کے علاوہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے بلکہ انھیں بعض سمتوں پر گامزن کیا ہے۔ صحافت کا بھی انسانی جذبات و احساسات سے گہرا تعلق ہے بعض مرتبہ ایک ناول سے زیادہ کسی اخبار کی خبر ہمارے جذبات و احساسات کی دنیا میں آگ لگا دیتی ہے۔ صحافت پر یہ الزام

عائد کیا جاتا ہے کہ ایک صحافی' زندگی کو جس حالت میں دیکھتا ہے وہ جوں کا توں پیش نہیں کرتا بلکہ اپنی طرف سے حذف و اضافے کرکے ایک ہیجانی پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے۔ یہ الزام تو ادب پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ صحافت کو واقعات کے اسباب و علل سے زیادہ اصل واقعہ سے دلچسپی ہوتی ہے۔ جبکہ ایک ادیب کو واقعہ سے زیادہ اس کے اسباب و علل کی فکر لاحق ہوتی ہے اردو ادب میں ایسے کئی اخبار و جرائد منظر عام پر آئے جن کا طرزِ صحافت' فرانس کی صحافت سے ملتا جلتا ہے جہاں خبریں ذیلی حیثیت رکھتی ہیں اور زیادہ تر اخبار کی ادبیت پر زور دیا جاتا ہے فرانس میں خبروں سے زیادہ تبصرے نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی NEWS سے زیادہ VIEWS کو ترجیح دی گئی۔ خاص طور پر اردوئے پنچ' تہذیب الاخلاق' الہلال' البلاغ اور بعض دیگر اخبارات میں ہم کو یہ رجحان زیادہ ملتا ہے۔

مغرب میں آج ادب اور صحافت دوش بدوش چل رہے ہیں۔ ان میں زبان' اسلوب' طرز بیان کی یکسانیت پائی جاتی ہے اپنے بعض مقاصد میں مختلف ہوتے ہوئے بھی، وہ بہت سارے امور میں مشترک ہیں اردو میں بھی اس نئے مزاج کو پورے زور و شور سے جاری کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا ادب زندگی سے قریب ہی نہیں بلکہ زندگی کی آواز بن جائے۔ زندگی کے بے شمار مسائل کو سمجھانے اور سلجھانے کے لیے ادب اور صحافت دونوں شعبے موزوں بھی ہیں اور مناسب بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے ادب کو صحافت کے ذریعے اور صحافت کو ادب کے ذریعے پیش کرتے ہوئے زندگی کی حقیقی ترجمانی کی جائے ادب اور صحافت کی زبان ایک ہے لیکن لب و لہجہ کی علٰحدہ علٰحدہ انفرادیت ایک کو دوسرے سے ممیز کرتی ہے۔ جارج سنٹیانا نے کہا تھا کہ صحافت واقعات کا اظہار ہے اور ادب

واقعات کو خیالات میں تبدیل کرنے کا نام ہے لیکن اب صحافت میں واقعات و خیالات یکجا ہو رہے ہیں اور ادب خیالات کے ساتھ واقعات کو پیش کرتے ہوئے ذہن و فکر کی تعمیر میں اپنا اہم رول ادا کر رہا ہے حقیقت اور سچائی دونوں میں پائی جاتی ہے۔ ایک واضح ہے اور دوسری مبہم۔ بس یہ دونوں کی اہمیت و افادیت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے!

سرسید ۔ اُردو کے صحیفہ نگار ادیب

برنارڈشا نے کہا کہ "اعلیٰ ادب اور بُلند پایہ ادبی شہ پارے درحقیقت صحافت ہیں شا کے اِس بیان کی روشنی میں اگر ہم اردو نثر کا جائزہ لیں تو سرسید کی تحریریں خاص طور پر "تہذیب الاخلاق" کے مضامین کو جہاں بُلند پایہ ادبی حیثیت حاصل ہے وہاں صحافتی نقطہ نظر سے بھی انھیں نہایت اہمیت حاصل ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں انگلستان کی سماجی زندگی کم وبیش ایسی ہی پس ماندگی کا شکار تھی جیسے اُنیسویں صدی میں ہندوستانی قوم کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریز زندگی کے ہر معاملے میں فرانسیسوں کی اندھا دھند تقلید کرتے تھے۔ ممتاز برطانوی ادیب اڈیسن اور اسٹیل نے انگریز قوم کی اس پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے مشہور جرائد SPEETAT-R اور TATLOR جاری کیے۔ سرسید جب ۱۸۶۹ میں انگلستان گئے تو انھوں نے ان پرچوں کے مقصد اور نصب العین اور عوام میں ان کے اثر و رسوخ کو محسوس کیا چنانچہ انھوں نے بھی اس بات کو بھی شدت سے محسوس کیا کہ ہندوستانی قوم کی تہذیب وتعمیر کے لیے اسی طرح کے پرچے کی اجرائی ناگزیر ہے۔ سرسید نے محسوس کیا کہ انگریزی زبان کے یہ انشا پرداز اڈیسن اور اسٹیل الفاظ سے کھیلنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اُن کے نزدیک خیال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ الفاظ کو وہ صرف خیال کے ابلاغ و ترسیل کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جہاں ایک لفظ کے ذریعہ خیال کی وضاحت ہو جائے تو وہ دوسرا زائد لفظ استعمال نہیں کرتے مغربی ادیبوں کا یہ صحافتی اندازِ تحریر سرسید کو نہ صرف

پیدا نہ آیا بلکہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی تحریریں بھی ایسی ہوں کہ اوسط درجے کا پڑھا لکھا آدمی انھیں پڑھ کر بآسانی سمجھ سکے اور متاثر ہو۔ چنانچہ سرسید نے اپنی تحریروں کو مستقل طور پر ایسا ہی رنگ و آہنگ دیا۔ سرسید کا اسلوب تحریر دراصل اردو نثر میں صحافتی انداز تحریر کا آغاز ہے۔ اس لیے میری نظر میں سرسید اردو کے ممتاز صحیفہ نگار ادیب ہیں جنھوں نے بہت پہلے ہی اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ مغربی ادب میں یہ نیا رجحان اردو ادب کے لیے بھی فالِ نیک ثابت ہوگا وہ ایڈیسن اور اسٹیل کی تحریروں سے اس قدر متاثر معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے بعض مضامین ایڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

سرسید نے ۲۴۔ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق جاری کیا جو چھ سال تک بہ پابندی شایع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ تین سال بعد اسے پھر جاری کیا گیا دو برس پانچ ماہ جاری رہ کر اس کی اشاعت مسدود ہو گئی ان کے بعد بارہ سال کے وقفہ سے ۱۸۹۴ء میں اس کا تیسرا دور شروع ہوا اس پرچہ کو مختلف نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود اپنے منفرد اسلوب اور ندرت فکر کے اعتبار سے بے پناہ مقبولیت حاصل رہی۔

آج مغربی ادب میں صحافت اور ادب ایک دوسرے سے ہمقدم ہیں اور اس نئے رجحان نے اچھی صحافتی تحریر کو ادب میں اور سلیس و عمدہ ادبی تحریروں کو صحافت میں شامل کیا ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن کے مضامین بہترین انشائیے ہی نہیں بلکہ صحافتی نقطۂ نظر سے انگریزی کے اچھے فیچرز ہیں۔

صحافت کا مقصد دراصل گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے قاری کو آگاہ کرنا پھر ان کی توضیح، تشریح، رہنمائی اور ذہن و فکر کے لیے تفریح طبع کے سامان فراہم کرنا ہے کوئی بھی صحافی اپنی تحریروں میں جن خیالات کو پیش کرتا ہے اس کا مقصد حالات سے روشناس کروانے

کے علاوہ قاری کے ذہن کو ایک مخصوص نقطۂ نظر کا حامل بنا دیتا ہے۔ صحافت رائے عامہ کو ہموار کرنے مؤثر بنانے اور فعّال حیثیت دینے میں نمایاں رول انجام دیتی ہے۔ سرسید نے بھی صحافت کے اسی مقصد کو پیش نظر رکھا۔ انھوں نے گرد و پیش کے حالات کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے اُن کی صداقت اور خلوص کے ساتھ توضیح و تشریح کی۔ پھر قاری کے ذہن و فکر کی تعمیر و تربیت میں نمایاں حصّہ لیا۔ سرسید کی تحریروں نے افراد سماج اور پورے معاشرے میں تبدیلی و تغیّر پیدا کیا۔ انھوں نے مذہب سیاست، معاشرت تعلیم اور ادب کو ایک نقطۂ نظر دیا۔ انھوں نے الفاظ کی الٹ پھیر میں خود کو الجھائے بغیر ایک صحافی کی طرح اپنے قاری سے راست گفتگو کی جو اُن کی نثر نگاری کا کمال ہے۔ سرسید نے خود اپنی نثر نگاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "میری مثال ایسے شخص کی ہے جس کے گھر میں آگ لگ گئی ہو اور وہ بے تحاشا مدد کے لیے چلّا رہا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے موقعہ پر جو کچھ کہا یا لکھا جائے گا اس میں لفاظی اور ادبی صناعی سے بالکلیہ احتراز کیا جائے گا۔

سرسید نے اُردو نثر نگاری کو مغربی صحافتی ادب کا انداز بیان عطا کیا ہے وہ اپنے اسی نئے صحافتی اسلوب کو سماجی و اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ انھیں اسی میں کامیابی حاصل ہوئی۔ سرسید نے اُردو کے قدیم اسلوب تحریر کے خلاف بغاوت کی اُن کے نزدیک بنیادی اہمیت خیال کے اظہار اور اس کی تفہیم تھی، زبان کو انھوں نے صرف ثانوی حیثیت دی۔ سرسید نے اُردو تحریر کو زبان اور عبارت کے چنگل سے آزاد کرایا۔ اُردو کا قدیم طرز تحریر محض زبان کی گلکاریاں تھا جن کے ہجوم میں اصل خیال نظر سے اوجھل ہو جاتا۔ اُس دور میں وہ ادب، ادب عالیہ سمجھا جاتا تھا جو مشکل الفاظ، رنگین عبارت اور قافیہ پیمائی سے مزین ہو۔

سرسید نے اس قدیم روش کو ختم کرکے اُردو زبان وادب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تحریر میں عام فہم اور سیدھا سادہ انداز شروع کیا اُن کا یہ اسلوب کچھ ایسا چل پڑا کہ ان کے مخالفین نے بھی جو ان کے خلاف مضامین لکھتے اور رسالے نکالتے اسی اسلوب کو اپنا لیا کیونکہ اسی اسلوب کے سہارے وہ آسانی کے ساتھ اور موثر طور پر اپنا مقصد پورا کر سکتے تھے۔ سرسید نے اسپیکٹیٹر اور اسٹیلر سے متاثر ہوکر جو انداز تحریر اختیار کیا اس میں طریقۂ کار اور نصب العین مختلف ہونے کے باوجود وہ اُردو نثر میں ایک نئے ادبی رجحان کی حیثیت اختیار کر گیا۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو عزت اور خودداری کی منزل دکھائی چنانچہ تہذیب الاخلاق کی اجرائی کا مقصد دراصل سرسید کے خیال میں کامل تہذیب تھا وہ لکھتے ہیں "میرا مقصد قوم کے دین اور دنیا کی بھلائی اور ان میں تہذیب اور شائستگی پیدا کرنا ہے۔ سرسید نے صحافت کے اسلوب کو ادب کا جامہ پہنایا ہے اور ادبی مقاصد کی تکمیل کی۔ انھوں نے ایک بے باک اور دیانت دار صحافی کی حیثیت سے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے وہ عوام میں ایک صالح انقلاب، اور نکھرا ستھرا ذوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ سرسید کا تہذیب الاخلاق دراصل فرانسیسی اخبارات کی طرح خبروں سے زیادہ خیالات کو اہمیت دیتا تھا۔ سرسید کی ادبی تحریریں اُردو صحافت کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ تہذیب الاخلاق نے صحافت کا جو اعلیٰ معیار پیش کیا ہے آج تک بھی اُردو کا کوئی رسالہ اس معیار کو نہیں پہنچ سکا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے مضامین، بول چال کی عام فہم زبان میں ہوتے تھے لیکن ان میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مضامین ایسے مصلحین کے لکھے ہوئے تھے جن کے دل میں قوم کا حقیقی درد تھا اور جن کا مقصد

قوم کو پسماندگی و ذلّت سے نجات دلانا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں اپنے زمانے کے مسائل پر پوری طرح عبور تھا۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین آج بھی اردو میں انشائیہ نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

سرسیّد تہذیب الاخلاق اور خاص طور پر اپنے مضامین میں ادب اور صحافت کے فاصلوں کو سمٹتے نظر آتے ہیں انھوں نے موقتی موضوعات پر مضامین لکھے اور ان میں حقیقت پسندی، واقعیت، صداقت اور تاثر پیدا کر کے انھیں عظیم صحافتی شہ پاروں کا مقام دیا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ادب ماورائیت، تخیّل پسندی اور جذبات واحساسات کا نام ہے جس میں حقیقت کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے، سرسیّد نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ادب کے بارے میں اس تصوّر کو رد کیا ہے۔ سرسید کے مضامین کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی اصلاح نہیں تھا بلکہ وہ خیالات کو جوں کا توں پیش کرنے کے عادی تھے۔ ایک صحافی میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس طرح سرسید نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ایک صحیفہ نگار کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی اصلاح کی۔ اگرچیکہ ان کا مقصد بالکلیہ یہ نہیں تھا انھوں نے انگریزی زبان وادب کی خوبیوں کو اردو نثر میں سمو دیا ہے۔ اور مختلف اصناف میں اس طرز کو برقرار رکھتے ہوئے اردو زبان و ادب کو نیا پیرہن عطا کیا۔ سرسید کی اِن تحریروں میں سادگی اور حقیقت پسندی موجود ہے۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق کے اجراء کے ذریعہ فرد کے اخلاق کی اصلاح کی، قوم کو اس کے وقار کا اِحساس دلایا اور علمی ترقی کی طرف راغب کیا۔ سرسید نے اپنے اسی پرچے کے ذریعہ علمی اور مادّی حیثیت سے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ خاص طور پر مسلم قوم کے سیاسی، مذہبی، مجلسی

اخلاقی اور ادبی رجحانات کو تبدیل کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے زندگی کے متعدد گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ مجلسی اخلاق کے اصول بتائے۔ مذہبی افکار کی اشاعت کی اور ادب کو زندگی کی توانائی سے مالا مال کردیا تہذیب الاخلاق کو مسلمانوں میں فکر و نظر کی تبدیلی کا پہلا داعی قرار دیا گیا ہے۔ اس پرچے کے ذریعہ تحریر میں سچائی اور فطری انداز پیدا ہوا۔ تکلف، تصنع اور روایتی انداز تحریر کو ختم کیا گیا۔ پہلی مرتبہ شعر و شاعری اور ادب کو زندگی اور مقاصد حیات سے وابستہ کیا گیا۔ اس سے قبل ادب کو تفریح کے لیے استعمال کیا جاتا رہا اور ادب برائے ادب تصور کو نمایاں اہمیت حاصل رہی لیکن تہذیب الاخلاق نے ادب کو ایک کارآمد اور سود مند عمل بنا کر پیش کیا ہے۔ سرسید کے اس پرچے نے زندگی کو ادب سے اور ادب کو زندگی سے متعارف کرایا۔ اس پرچے کی وجہ سے تنقید اور تجزیے کا ایک مخصوص مزاج اردو زبان و ادب میں جلوہ گر ہوا۔

تہذیب الاخلاق کے دورِ اوّل میں کل ۲۲۶ مضامین شائع ہوئے جن میں ۱۱۲ سرسیّد نے لکھے۔ دوسرے دور میں ۶۷ مضامین میں سے ۲۳ مضامین سرسید کے ہیں۔ اور آخری دور میں پورے ۴۰ مضامین سرسید نے تحریر کیے ہیں۔ ان میں سرسیّد کے مضامین کی تعداد زیادہ ہے۔ اور دیگر مضامین کا اسلوب بھی سرسیّد کی پیروی نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے اس پرچے کے ذریعہ قوم کو لکھنا، پڑھنا، سوچنا، سمجھنا اور محسوس کرنا سکھایا ہے۔ انھوں نے صرف ایک ادیب کی طرح قلب و ذہن کے لیے سرور و مسرت کے سامان ہی فراہم نہیں کیے بلکہ ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے ذہن و فکر کے سانچوں میں نمایاں تبدیلی لائی۔ عام طور

پر کسی صحیفہ نگار کو اسی کے بے باکانہ خیالات کے باعث مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اسی پر مختلف گوشوں سے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال سرسید کے ساتھ بھی پیش آئی۔ سرسید کے افکار، ان کی تحریر اور اسلوب پر سخت اعتراضات کئے گئے بعض نام نہاد ادبی رہنماؤں نے ان کی تحریر اور اُن کے رسالے کو خارج از ادب قرار دیا۔ لیکن وہ اپنے بے باک قلم، جراءت مند افکار اور نئے اسلوب سے دست بردار ہونے پر مائل نہ ہوئے آخرکار مخالفتوں کا غبار خود اپنے آپ چھٹ گیا اور اس کے بعد ہی اردو نثر اور صحافت کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جہاں ادب اور صحافت اپنے بعض بنیادی اختلافات کے باوجود متعدد اُمور میں مشترک ہو گئے۔ سرسید نے ایک کامیاب صحیفہ نگار ادیب کی حیثیت سے ادب میں سادگی، فطری پن، خلوص، صداقت، برجستگی، بے ساختگی اور سلاست کا جو مزاج پیدا کیا ہے وہ اُن کا عظیم کارنامہ ہے۔ سرسید کی تحریریں جہاں بلند پایہ ادبی شہ پارے ہیں وہاں وہ اردو صحافت کے بہترین مرقعے ہیں۔ ان مضامین میں ادبی انشائیے کی خصوصیات کے باوجود حالات سے باخبر کرنے ان کی توضیح و تشریح، ذہن و فکر کی تربیت اور تفریح و طبع کے سامان فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو صحافت کے مقاصد کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ہم سرسید کو ادب اور صحافت کے خانوں میں بانٹ نہیں سکتے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ دونوں شعبوں کی باگ اپنے ہاتھ میں تھامے بڑی فنکاری سے موقعہ کے لحاظ سے دونوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ سرسید کی یہی خصوصیت انھیں ادب اور صحافت دونوں میں منفرد مقام اور بلند مرتبہ کا حامل بنا دیتی ہے۔

مولانا آزاد نے ۲۰۔ فروری ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے جلسۂ اسناد میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

'اغلب خیال یہ ہے کہ شام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات تہذیب الاخلاق نے چھوڑے ہیں، ہندوستان (برصغیر پاک و ہند) کے کسی اور رسالہ نے نہیں چھوڑے اس رسالہ کے اجرا سے موجودہ اردو ادب و صحافت کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو نے اس رسالہ کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔ اس دور کا شاید مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقۂ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دورِ جدید کے بلند معیار مصنفین اس خوانِ نعمت سے لقمے چنتے ہیں اور اسی حلقہ کے اثر و نفوذ سے نقد و بصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویئے متعین ہوئے۔'

فیچر نگاری

اخبارات میں ہر روز شائع ہونے والی بے شمار خبروں کے ذریعہ گرد و پیش کے حالات اور دنیا میں شب و روز ہونے والے بے شمار واقعات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے لیکن اخبار میں شائع شدہ ہر واقعہ نیوز نہیں کہلاتا اور نہ ہی یہ قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اخبارات کی خبریں جو ندرت، سنسنی اور نئے واقعات پر مشتمل ہوتی ہیں وہ قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے ہوئے ایک اچھا تاثر بھی دیتی ہیں۔ اس کی مثال اس واقعہ سے دی جاسکتی ہے کہ کسی اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے نئے تقرر شدہ رپورٹر کو ہدایت کی کہ وہ اس دن ریاست کے کسی وزیر کے لڑکے کی منعقد شدنی شادی کی پوری رپورٹ مرتب کر کے لائے چنانچہ جب رپورٹر دو گھنٹہ بعد واپس ہوا اور ایڈیٹر نے اس سے رپورٹ طلب کی تو اس نے کہا کہ وہ کیا رپورٹ مرتب کرتا جبکہ وہاں شادی ہی اچانک منسوخ کر دی گئی۔ ایڈیٹر نے نادان رپورٹر سے کہا کہ شادی کا ہونا اخبار کے قاری کی دلچسپی کے لیے اس قدر اہمیت کا حامل نہیں جتنا کہ اس کی منسوخی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خبر کا حقیقی مفہوم کیا ہے ہر نئی انوکھی اور غیر معمولی بات ہی درحقیقت نیوز کہلاتی ہے۔ خبروں سے ہم واقعات سے باخبر ہوتے ہیں لیکن ان کے محرکات عوامل اور امکانی نتائج معلوم کرنے کے لئے فیچرس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہا جاتا ہے کہ خبر کی انتہا فیچر کا نقطۂ آغاز ہے۔ فیچرس کسی بھی نیوز کو نہ صرف حرکت و حیات دیتے ہیں بلکہ اس کی مختلف طرح سے تعبیر و تشریح میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ فیچرس حقیقت پسندی، انسانی دلچسپی اور حالات کے صحیح تجزیہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔

فیچر نگاری کا آغاز درحقیقت دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا ہمارے ملک میں آزادی کے بعد فیچر کا رجحان مفقود تھا لیکن بعد میں ایسی بات کو شدت سے محسوس

کیا گیا کہ صرف نیوز سے پورے طور پر معلومات نہیں ہوتے پھر ان کی تفصیل، توضیح اور تحقیق بھی منظر عام پر نہیں آتی۔ فیچر مضامین نے اسی ضرورت کی تکمیل کی ہے فیچرس نہ صرف واقعات اور حالات سے قاری کو باخبر رکھتے ہیں بلکہ ذہنی تربیت، رہنمائی اور تفریح طبع کے سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان میں حقائق کو تفصیلی طور پر پیش کرکے واقعات کے پس منظر میں ان کے عواقب و نتائج کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ فیچرس میں معلومات کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو متاثر کرسکیں۔ اخباری رپورٹر جو کچھ دیکھتا ہے وہ بیان کرتا ہے لیکن ایک فیچر نگار نہ صرف واقعہ کی تصویر پیش کرتا ہے بلکہ پورے حالات کا مبصرانہ و ناقدانہ جائزہ لیتا ہے۔ فیچر کو ادب اور صحافت کے درمیان رابطہ کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ کئی فیچرس ادب کے زمرہ میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ فیچرس میں اسلوب، مواد، طرز بیان کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر نیوز میں اسلوب اور طرز بیان کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوتی لیکن فیچر نگاری میں ادبی خصوصیات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ بیشتر امور میں فیچر نگاری مضمون نگاری سے مماثلت رکھتی ہے۔ خبروں کی ترتیب اور ان کے اہتمام میں عام طور پر عجلت کی جاتی ہے تاکہ وقت مقررہ پر کسی بھی واقعہ کی حقیقی معلومات بہم پہنچائی جاسکیں لیکن فیچرس میں کوئی مقررہ وقت نہیں ہوتا اور فیچر نگار بڑے اطمینان کے ساتھ پورے واقعات کو تفصیلی تحقیق اور تجزیہ کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

فیچر نگاری کئی اعتبار سے نمایاں خصوصیات رکھتی ہے۔ آج کل صحافت میں اس رجحان کو تقویت پیدا ہوگئی ہے کہ صرف خبروں کی سربراہی ہی اخبار کا کام نہیں ہے بلکہ خیالات و افکار کو پیش کرنا بھی نہایت ضروری ہے فیچر نگاری میں نیوز سے زیادہ واقعات کی توضیح و تشریح کو اہمیت حاصل ہے۔ ایک فیچر نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تجسس و تحقیق

کی صلاحیت ہو اور وہ اپنے دوسروں تک پیش کرنے کا فن جانتا ہو۔ فیچر نگار کو یہ بھی محسوس کرنا چاہیئے کہ وہ جن موضوعات پر بھی لکھ رہا ہو ان سے قارئین کو دلچسپی ہونا لازمی ہے۔ ایسے فیچرس جن میں معلومات کے علاوہ عام انسانی دلچسپیوں کے سامان فراہم نہیں کیئے جاتے وہ کامیاب فیچرس نہیں کہلاتے۔ فیچر نگاری میں ضروری ہے کہ فیچر نگار پورے اعتماد اور جوش و خروش کے ساتھ اپنی تحریر میں زندگی کی آب و تاب پیدا کرے۔ اور قاری کے ذہن کو اپنی تحریر کا اسیر بنالے۔ فیچر نگار کا مشاہدہ تیز، فکر و نظر وسیع اور زبان و بیان پر کامل عبور ناگزیر ہے۔ حقائق کو پیش کرتے ہوئے فیچر نگاری میں اکتاہٹ کا احساس نہیں ہونا چاہیئے۔ تحریر میں یکسانیت اور حد درجہ سادگی کی بجائے ادبی چاشنی کا بھی ہونا ضروری ہے فیچرس میں واضح خیالات، برجستہ تحریر، مناسب و موزوں الفاظ کا استعمال موثر تحریر عام فہم انداز اور سادہ و سلیس زبان کا استعمال ضروری ہے۔ فیچر نگاری میں الفاظ کی الٹ پھیر اور مبہم خیالات سے احتراز ضروری ہے ورنہ ایسے فیچرس صحافت سے زیادہ تخیلی ادب میں شمار کیئے جائیں گے۔

مغرب میں فیچر نگاری کو ایک مستقل صنف کا درجہ دیا گیا ہے۔ اکثر صحیفہ نگاروں نے اسے ایک باقاعدہ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کیا۔ چنانچہ کئی فیچرس تجارتی و کاروباری نقطۂ نظر سے بھی لکھے جانے لگے ہیں۔ امریکہ و برطانیہ میں اخبارات و جرائد کے مالکین فیچر نگار کو نہایت مناسب و معقول معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ فیچرس، سیاسی، معاشی، سماجی اور دیگر بے شمار موضوعات پر لکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے حدود لامتناہی ہیں۔

فیچر نگار گرد و پیش کے حالات سے نہ صرف باخبر رہتا ہے اور ان حالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحریر کو خلوص، صداقت اور جوش و خروش

سے معمور رکھتا ہے۔ تجسس و تحقیق کا مادہ بھی ضروری ہے کیونکہ تجسس و تحقیق ہی دراصل افکار و خیالات کا سرچشمہ ہیں۔ فیچر نگار میں تحریری صلاحیت و قابلیت بھی ضروری ہے۔ تا وقتیکہ وہ تحریر کے فن کا ماہر نہ ہو وہ افکار و خیالات کو کامیابی سے پیش نہیں کر سکتا۔ کئی فیچرس انٹرویوز اور شخصی بات چیت کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں اس لیے فیچر نگار کو نہایت ہوشیاری اور تدبر کے ساتھ بڑی بڑی شخصیتوں سے انٹرویو لینا چاہیئے۔ عام طور پر شخصی رائے یا ذاتی خیالات کو پیش کرنے سے زیادہ حالات کا عام انداز میں جائزہ لینا کامیاب فیچر نگاری کی علامت ہے۔ فیچر نگاری میں واقعات کو پوشیدہ رکھنا اور مبہم انداز میں پیش کرنا بڑی خاص چیز سمجھی جاتی ہے۔

موجودہ دور میں فیچر نگاری کے امکانات نہایت روشن ہیں۔ اب ہمارے اخبارات اور رسائل بے شمار فیچرس پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اخبارات کے ہفتہ وار ایڈیشن میں فیچرس کا وجود ایک ناگزیر عمل بن گیا ہے۔ فیچر نگار کے لیے نئے حالات پر اظہار بیان اور تبصرہ کا یہ سب سے موثر ذریعہ ہیں۔ خیالات کی توضیح و تشریح افکار کی ترسیل و ابلاغ فیچر نگاری کا نمایاں وصف ہے۔ اس کے علاوہ فیچر نگار مختلف شخصیتوں کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کر اور انٹرویو کے ذریعہ ان کے نقطۂ نظر سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ یہ صورت حال بھی فیچر نگاری کی آب و تاب میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔ فیچر نگاری میں شخصی اثر و رسوخ، منفرد اسلوب دلچسپ پیرایۂ بیان اور واقعات کا غیر جانبدار تجزیہ ضروری ہے۔ عوام کی جانب سے فیچر نگار کو اسی وقت مسلمہ حیثیت حاصل ہوتی ہے جب وہ عوام کے مزاج اُن کی علمی سطح اور حالات کو حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کرنے کی عادت پیدا کرے۔ ایک بڑے دانشور نے کہا ہے کہ "دنیا ادیب کا کارخانہ ہے ادیب اپنے افکار و خیالات کے ذریعہ

رائے عامہ کو ہموار کرتا ہے اور اپنے ذہن و فکر کی روشنی سے قاری کے زاویۂ فکر کو جلا دیتا ہے۔

فیچر نگار کو بعض خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے خاص طور پر خبروں کے سلسلہ میں اس کی 'قوتِ شامّہ' نہایت تیز ہونی چاہیئے اس کے علاوہ وہ کئی موضوعات پر شائع ہونے والے متعدد فیچر مضامین کا مطالعہ کرتا رہے۔ فیچر نگاری میں تجسّس و تحقیق کا جذبہ، ذہن اور تیز مشاہدہ ناگزیر ہے۔ زبان و ادب پر مہارت تحریر کے نئے انداز اسلوب سے واقفیت عوامی مزاج کو سمجھنے کی صلاحیت اور جذبات، احساسات سے آگاہی کامیاب فیچر نگاری کا خاصّہ ہیں۔ فیچر مضامین کے لیے موضوعات کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی مخصوص ذرائع وسائل کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ پھر بھی عام طور پر ایک فیچر نگار کو تین اہم ذرائع سے معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں مشاہدہ تجربہ اور اخبارات و کتابیں شامل ہیں۔

فیچر مضامین کی متعدد قسمیں ہیں۔ ہر فیچر نگار اپنے مخصوص انداز فکر کے ذریعہ ان کی خاص تعبیر کرتا ہے لیکن عام طور پر فیچرس کی چھ قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ بیانیہ فیچر ۲۔ شخصی فیچر ۳۔ انٹرویو فیچر ۴۔ افادی و معلوماتی فیچر ۵۔ سائنسی و معاشی اور سماجی فیچر ۶۔ شخصی خاکہ

۱۔ بیانیہ فیچر NARRATIVE FEATURE بیانیہ فیچر نگاری میں کسی بھی واقعہ کو بیان کرنے کے لیے بیانیہ، مکالماتی یا تجزیاتی انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ قاری کا ذہن معلومات کے علاوہ گہرا تاثر اور دلچسپ تفریح حاصل کرتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں اس طرح کے فیچرس کا عام رواج ہے۔

۲۔ شخصی و تجرباتی فیچر PERSONAL & EXPERIENCE FEATURE اس طرح کے فیچر مضامین میں فیچر نگار اپنے غیر معمولی تجربوں اور بعض مرتبہ مشاہدہ پر مبنی واقعات کو پیش کرتا ہے اس طرح کے فیچرس میں معلومات سے زیادہ ذہنی دلچسپی و تفریح کے سامان پیدا کیے جاتے ہیں۔

۳۔ انٹرویو فیچر INTERVIEW FEATURES اس طرح کے فیچرس مختلف شخصیتوں سے لیے گئے انٹرویو کے دوران پیش کردہ خیالات و افکار پر مبنی ہوتے ہیں ان کے ذریعہ ہم کسی بھی موضوع پر بڑی شخصیتوں کے افکار و خیالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ انٹرویو فیچرس ہمارے نقطۂ نظر کو متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

۴۔ افادی و معلوماتی فیچر UTILITY FEATURE فیچر نگار قاری کو اپنے مضامین کے ذریعہ مختلف معلومات اور مشورے دیتا ہے۔ بعض حالات میں ذہنی رہنمائی و تربیت کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ وایسے فیچرس جن میں انسانی خواہشات کی تشفی اور دلچسپی کے نئے نئے سامان فراہم کیے جاتے ہیں انھیں افادی فیچرس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۵۔ سائنسی معاشی اور سماجی فیچرس عام طور پر سائنسی معاشی اور سماجی ماہرین کے مضامین اسی زمرے میں آتے ہیں۔ جن میں نئے حالات پر تنقید و تبصرے کیے جاتے ہیں۔ ان فیچرس سے قاری کو ماہرین کی رائے سے واقفیت کا موقع حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ شخصی خاکہ THE PERSONALITY SKETCH شخصی خاکہ میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کی خوبیوں اور خامیوں اور اُن کے کارناموں کو مضامین کے ذریعے

پیش کیا جاتا ہے ۔ ان میں نہ صرف زندگی کے حالات اہم واقعات کا ذکر ملتا ہے بلکہ ان کی ترقی و کامیابی کے اسباب و علل کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے ۔

اردو میں فیچر نگاری کا رواج باقاعدہ نہیں ہوا لیکن اِدھر کچھ عرصہ سے فیچر نگاری کی اہمیت و افادیت کا احساس اردو صحیفہ نگاروں میں پیدا ہو گیا ہے ۔ توقع ہے کہ مستقبل میں اردو صحافت میں فیچر نگاری کو مستقل حیثیت دی جائے گی تاکہ ہمارے اخبارات صرف خبر نامے ہی نہیں بلکہ انھیں خیالات و افکار کے سرچشمے کی حیثیت حاصل رہے ۔

عابد صدیقی

عابد صدیقی ۳۱۔جنوری ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد کے ممتاز
علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد محترم قاضی برہان الدین
احمد صدیقی مرحوم (علیگ) حیدرآباد کے ممتاز صحافی تھے۔ عابد صدیقی نے دارالعلوم
ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔ انوارالعلوم کالج سے بی ایس سی کی تکمیل
کی۔ ہائی اسکول اور کالج کے زمانے میں تقریری و تحریری مقابلوں میں حصّہ لیتے
رہے۔ متعدد بین المدارس و بین الکلیاتی تقریری تحریری اور عام معلومات کے
مقابلوں میں انعامات اول و دوم حاصل کیے۔ طلباء یونین کے سکریٹری اور
بزم اردو کے صدر منتخب ہوئے۔ کالج میگزین 'انوار' اور انگریزی زبان
میں جاری کردہ نیوز لیٹر کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نمایاں کام انجام دیئے
حیدرآباد کی مختلف علمی ادبی اور سماجی تنظیموں میں سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیتے
رہے۔ اب بھی کئی علمی و ادبی انجمنوں سے باقاعدہ وابستہ ہیں۔

عابد صدیقی نے گریجویشن کے بعد دفتری ملازمت اختیار کرلی۔ لیکن
اس ملازمت کو مزاج کے مطابق نہ پاکر دوبارہ تعلیم کی طرف راغب ہوئے
عثمانیہ یونیورسٹی سے ام۔ اے درجہ اوّل میں کامیاب کیا اور جرنلزم
میں ڈگری لی۔ ابتداء ہی سے تقریر و تحریر کا بے حد شوق رہا۔ افسانے
اور مضامین لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین متعدد رسائل اور
اخبارات میں شائع ہوئے۔ عابد صاحب بہترین مترجم بھی ہیں۔ انگریزی
سے اردو میں بڑا سلیس ترجمہ کرتے ہیں ان کے کئی ترجمے اخبارات
میں شائع ہوچکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی مختلف مضامین اور
افسانے نشر ہوا کرتے ہیں۔ نشری مباحثوں اور اہم موضوعات پر متعدد

ریڈیائی سمیناروں میں انھوں نے حصّہ لیا ہے۔ گزشتہ چار برس سے اخبار رہنمائے دکن میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سنٹرل انسٹیٹوٹ آف انگلش سے انگریزی تحریر میں مہارت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ دارالعلوم دیوبند سے فاضل میں درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔

عابد صدیقی نے شعلہ بیان مقرر، بہترین ادیب اور ایک بیباک نوجوان صحافی کی حیثیت سے بہت کم عرصہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت ہی کے مالک نہیں بلکہ آواز بھی بڑی خوب پائی ہے۔ کالج کے زمانے میں ان کی دی ہوئی کامنٹری کی دھوم تھی۔ انگریزی اور اردو ڈراموں میں بھی کام کر چکے ہیں۔ مذہب اور ادب ان کے خاص موضوعات ہیں۔ عابد صدیقی جامعہ عثمانیہ سے اقبال اور حکیمان ہند پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ ان دنوں سکندرآباد آرٹس اینڈ سائنس کالج میں اردو لکچرار کی حیثیت سے گریجویشن کے طلبا کو پڑھا رہے ہیں۔ انڈین انسٹیٹوٹ آف اقبال اسٹڈیز، اسلامک اسٹڈیز سنٹر کی سرگرمیاں اور دیگر بے شمار علمی و ادبی مصروفیات کے باوجود ادب پر ان کا مطالعہ گہرا اور ان کی فکر پرواز بلند ہے۔ 'ادب و صحافت' ان کی ایک کامیاب ادبی کوشش ہے۔ خلوص، ہمدردی، خوش اخلاقی اور شگفتہ و نرم لب ولہجہ اور دیگر کئی خصوصیات کے حامل ہیں۔ علم و اخلاق کی بہترین صفات کے باوجود انکساری اور سادگی کے جوہر نے ان کی شخصیت کو پرکشش بنایا ہے۔

مصنّف کی دیگر کتابیں

۱۔ نشاط کی کلیاں ' افسانوں کا مجموعہ ' (زیرِ طبع)

۲۔ زبان و قلم ' اخباری مضامین کا مجموعہ ' (زیرِ طبع)

ADAB - AUR - SAHAFAT

(LITERATURE & JOURNALISM)

★

ABID SIDDIQUI,

M. A. B. J (Osm.)

Research Scholar Urdu Dept.

Lecturer Secunderabad Arts and Science College O. U.